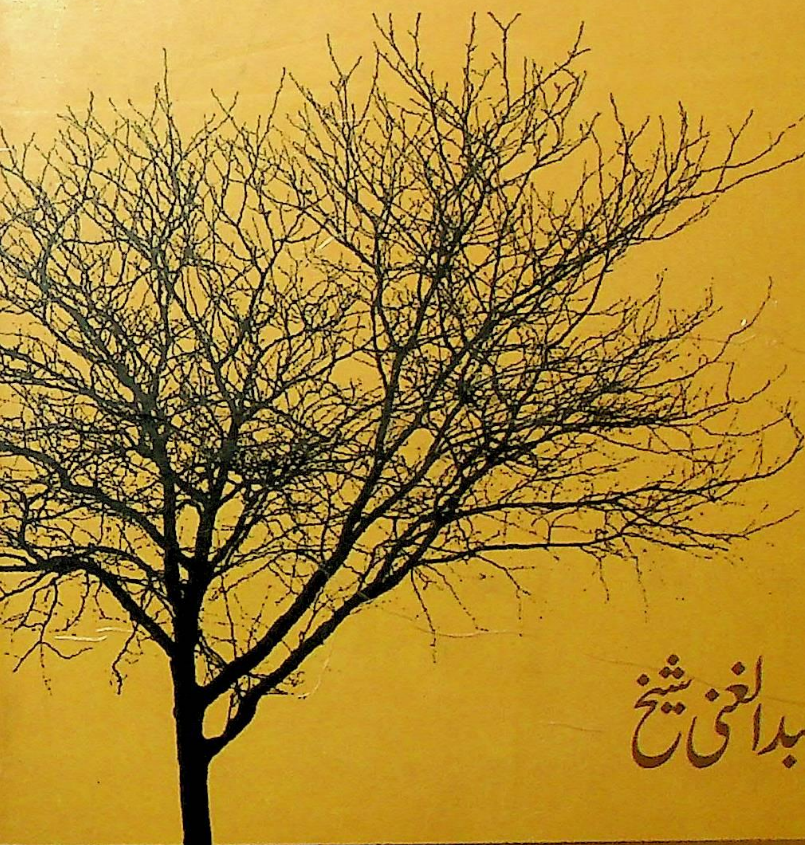
دو ملک، ایک کہانی

افسانے



عبدالغنی شیخ

اپلائنڈ بکس

دو ملک، ایک کہانی

افسانے

عبدالغنی شیخ

دو ملک، ایک کہانی

افسانے

عبدالغنی شیخ

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS

کتاب کا نام	:	دو ملک، ایک کہانی (افسانے)
مصنف	:	عبدالغنی شیخ
مصنف اور ناشر کا پتا	:	'یاسمین'، فورٹ روڈ، لیہ، لداخ-194101 موبائل نمبر:9419840050
سن اشاعت	:	اگست 2015
صفحات	:	344
قیمت	:	-/250روپے
زیر اہتمام	:	محمد عارف اقبال

ISBN 978-93-83239-24-5



APPLIED BOOKS
Publishers & Distributors
1739/10 (Basement), New Kohinoor Hotel, Pataudi House,
Darya Ganj, New Delhi - 110002 Tel.: 011-23266347
Email: appliedbooks@gmail.com

ملنے کے پتے:

- اردو بک ریویو، 1739/3 (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-110006
- بک امپوریم، سبزی باغ، اردو بازار، پٹنہ-800004 (بہار)

DO MULK, AIK KAHANI (Urdu Short Stories)
Author: Abdul Ghani Shaikh
Ist Edition: August 2015 Pages: 344 Price Rs. 250/-
Printed at: Jaico Printers, New Delhi - 110002

انتساب

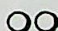
والدہ مرحومہ
کے نام



ترتیب



ترتیب



پیش لفظ

''دو ملک، ایک کہانی'' عبدالغنی شیخ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں 45 کہانیاں ہیں جو نصف صدی کے دوران ہندوستان کے مختلف اردو رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ ان رسائل میں شمع، آجکل، بیسویں صدی، شاعر، بانو، ایوانِ اردو، جدید فکر و فن، شیرازہ وغیرہ شامل ہیں۔

مجموعہ میں مزاحیہ کہانیاں جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا، ایک انار سو بیمار اور اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں عبدالغنی شیخ نے اپنے علاقے اور وادی کشمیر کے مسائل کو مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

عبدالغنی شیخ کی کہانیوں میں تنوع اور زندگی کی رنگا رنگی ہے۔ ہر کہانی انسانی نفسیات، زندگی کی کسی حقیقت اور سماج کے کسی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ جیسے ان کی کہانی 'غیر یقینیت' میں ایک مزدور کی بے کسی، 'راشن کارڈ' میں ایک عام آدمی کی بے بسی، 'سوئمنگ پول' میں نفسا نفسی، 'دھوپ چھاؤں' میں زندگی کی اونچ نیچ اور 'مسافر' زندگی کی بے ثباتی کی عکاسی کرتی ہے۔ 'مجرب نسخہ' کہانی میں جہاں یہ دکھایا گیا ہے کہ کرپشن کی جڑیں کتنی گہری ہیں، وہاں کہانی 'مظلوم' یہ غمازی کرتی ہے کہ مظلوم صرف عورت ہی نہیں۔ مسکراہٹ، یادیں، ایک رات، اور دل ہی تو ہے، انسان کے فطری پیار و محبت کے جذبے کا اظہار ہیں۔

عبدالغنی شیخ کی ایک درجن کہانیوں کا انگریزی اور لگ بھگ اتنی ہی کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ ہوا ہے۔ ''پہلا خط'' اور ''ہوا'' کا جرمنی اور ''نام'' اور ''جینی'' کا ترجمہ بالترتیب تیلگو اور

کشمیری زبانوں میں مرتب بہترین کہانیوں کے خصوصی شماروں میں موجود ہے۔

بطورِ افسانہ نگار عبدالغنی شیخ کی پذیرائی ہوئی ہے۔ جموں و کشمیر اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن نے عبدالغنی شیخ کی کہانی ''دادی اماں'' کا انگریزی ترجمہ میٹرک نصاب میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، دہلی نے مصنف کو اپنی ایک مطبوعہ کہانی سنانے کے لیے دہلی میں منعقدہ ایک کل ہند سمینار میں مدعو کیا۔ ان کی ایک کہانی ''ہوا'' کی انگریزی مترجم ڈاکٹر روینہ اگروال ہیں۔ انہوں نے آرہاس، ڈنمارک میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں یہ کہانی پڑھی۔ اس کہانی کا چار زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔



یہ زندگی

بیماری کی نوعیت سے متعلق ڈاکٹر کا منہ پر صاف صاف کہہ دینے سے نہ صرف اس کے دل و دماغ پر چوٹ لگی بلکہ بہت برا بھی لگا۔ ''یہ ٹھیک ہے میں ایک آرٹسٹ ہوں لیکن کیا آرٹسٹ انسان نہیں ہوتا؟ آرٹسٹ کا دل نہیں ہوتا؟ آرٹسٹ کے احساسات اور جذبات نہیں ہوتے؟ یہ بھی طریقہ ہے بتانے کا!'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''آپ آرٹسٹ ہیں، فنکار ہیں، آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ آپ کو معدے کا کینسر ہے۔''

اس کا دل ڈوب گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور ڈاکٹر کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے کلینک سے باہر نکل آیا۔

وہ سڑک پر بلاوجہ چلتا رہا۔ ایک دفعہ ایک گاڑی کی زد میں آتے آتے بچ گیا۔ ڈرائیور نے غلیظ سے گالی دی لیکن نازک مزاج اور حساس ہونے کے باوجود اس پر اس گالی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

موسم بڑا سہانا تھا۔ فضا بڑی دلکش تھی۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں سپید بادل تیر رہے تھے۔ ڈاکٹر سے ملاقات سے پہلے انہیں دیکھ کر اس نے عجیب طمانیت محسوس کی تھی اور اس کے فنکارانہ ذہن میں یہ خواہش شدت سے ابھری کہ اس منظر کو کینو اس پر اتارے۔ لیکن کلینک سے باہر آکر دنیا اسے مختلف لگی۔ اس کو یہ محسوس ہوا کہ دنیا کی ان خوبصورت چیزوں پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ چند ہی روز تو اسے اس دنیا میں رہنا ہے۔

مرنے کے بعد میری بیوی اور اکلوتی بچی کا کیا ہوگا؟ — انہیں جب اس کی بیماری کا علم ہوگا، تو ان کا کیا ردعمل ہوگا؟ اس تصور سے وہ کانپ اٹھا۔

اچانک اس کے سر کے اوپر سے کبوتروں کی ایک ڈار گزری۔ لیکن اس کو خبر تک نہیں ہوئی۔

تین روز پہلے وزیر ثقافت نے اس کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کیا تھا اور اس کے فن کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔ نمائش میں اس کی بنائی ہوئی دو تصویریں دس دس ہزار روپے میں فروخت ہوئی تھیں۔

اس شام جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹا تو اس کی طبیعت پھر خراب ہوئی۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ معدے کے درد کا شکار تھا۔

''آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔'' اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایک اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیجئے۔ دن رات آپ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ جب صحت نہیں ہے تو روپیہ پیسہ کس مصرف کا؟''

''میں کل ضرور دکھاؤں گا۔'' اس نے بیوی کو یقین دلایا۔

ڈاکٹر کی ہدایت پر خون، پیشاب اور تھوک کے علاوہ Biopsia ٹسٹ کرایا۔

وہ ایک عظیم مصور بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ رافیل، پکاسو، لیونارڈ و انسی، ایم ایف حسین کی طرح... ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن اس کی تصویروں کی دنیا میں دھوم مچے گی لیکن اب اس کو اپنے سارے خواب بکھرتے نظر آئے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسی حالت میں گھر جائے اور بیوی کو شک ہو جائے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی بیوی کو اس کی بیماری کی بھنک پڑ گئی تو اس کا گھر غم کدہ اور جہنم زار بن جائے گا۔

اس نے سگریٹ کی ایک ڈبیہ خریدی۔ سگریٹ چھوڑے اس کو ایک سال ہو گیا تھا، اب مسلسل پینے لگا۔

اس نے ایک سائیکل رکشا والے کو روکا اور اس پر بیٹھ گیا۔

''کہاں جانا ہے بابو جی؟'' رکشا والے نے پوچھا۔

''پارک۔''

''پارک! کون سا پارک؟ پارک تو بہت ہیں۔'' رکشا والا بولا۔

''کوئی سا پارک لے چلو جہاں تنہائی ہو۔'' اس نے غائب دماغی سے کہا۔ رکشا والا ہنس پڑا۔

اس کو دبلے پتلے رکشا والے پر رشک آیا کہ یہ کتنا خوش و خرم ہے۔

پارک میں چاروں طرف کیاریوں میں گلاب، گل لالہ، ڈالیہ اور دوسرے رنگ برنگ پھول کھل رہے تھے۔ لیکن ان پھولوں میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ ایک سنگی بینچ پر ایک جوان مرد اور خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ ''شاید نو بیاہتا جوڑی ہے۔'' اس نے سوچا۔ دونوں نے اس کی طرف ایک نظر ڈالی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے سوچا کہ ان کو کیا پتہ ہے کہ میں کینسر کا مریض ہوں۔

وہ درختوں کے ایک کنج میں دوب پر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ نت نئے خیالوں اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔

میاں بیوی نے کتنے سارے منصوبے باندھے تھے۔ اپنے لیے ایک خوبصورت مکان بنانے کا، ایک کار خریدنے کا اور بیرون ملک جانے کا۔ اب یہ سارے منصوبے خاک میں ملتے نظر آنے لگے۔

اس کو اپنے دوست خاص کر اکبر یاد آیا۔ ہمیشہ پریشان رہنے والا دائم المریض اکبر۔

''اکبر! میں تم سے پہلے جا رہا ہوں۔'' اس نے دور خلا میں نظریں جما کر آہستہ سے کہا۔

''مرنے کا مطلب ہے دنیا سے قطعی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق۔ خدا جانے امریکہ کا چھوڑا ہوا وہ مصنوعی سیارہ کیا خبر لائے گا، جو ہمارے نظام شمسی کو پھاند کر کائنات میں کسی ذی حیات کی تلاش کے لیے گیا ہے۔ یہ خبر سننے کے لیے میں نہیں ہوں گا۔''

وہ بڑا احساس تھا۔ ایک دفعہ اس کی بیوی کو پکنک سے آنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے اسپتال فون کیا۔ اتفاق سے اس روز ایک بس کا حادثہ ہوا تھا۔ وہ اسپتال جا کر زخمیوں میں اپنی بیوی کو ڈھونڈنے لگا۔

پارک میں آئے اب تین گھنٹے ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ میں آیا۔ ''کئی دفعہ ایک بڑے ڈاکٹر کو بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ اس کی تشخیص غلط ہو سکتی ہے۔'' اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ ''میڈیکل رپورٹ کا بھی بھروسہ نہیں۔ آج کل لیباریٹریوں میں اتنے کیس آتے ہیں کہ کئی دفعہ رپورٹیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیماری ابتدائی اسٹیج پر ہو اور ریڈئیشن یا آپریشن سے ٹھیک ہو جائے۔ مجھے ڈاکٹر کی بات پوری سننی چاہئے تھی— یہ بھی ضروری نہیں کہ کینسر کا ہر مریض مر جائے۔ کئی دفعہ کینسر کا مریض معجزاتی طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ خود اپنا نفسیاتی معالج بن گیا تھا۔ اس سے اس کے دل کو یک گونہ اطمینان ملا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس ایک دفعہ دوبارہ جانے کا ارادہ کیا۔

پارک سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک دفعہ اور تہیہ کیا کہ وہ اپنے اندرونی کرب کو بیوی کے سامنے ظاہر ہونے نہیں دے گا اور اپنے روزمرہ کا کام جاری رکھے گا۔

انہی خیالات میں غلطاں وہ اٹھا۔ اس کے معدے میں پھر درد ہونے لگا۔ جیب سے ایک ٹکیہ نکال کر اسے نگل لی اور تھوڑا سا افاقہ محسوس کیا۔

پارک سے باہر زندگی کی گہما گہمی اور لوگوں کی ریل پیل دیکھ کر موت کا سایہ دوبارہ لاشعوری طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے دل کو جو دلاسہ دیا تھا، اس کا اثر کھونے لگا۔

گھر جانے کے لیے اس نے ایک آٹو رکشہ پکڑا۔ وہ گھر سے ذرا دور اتر گیا۔ پبلک نل پر بوڑھا سقہ اپنی مشک میں پانی بھر رہا تھا۔ اسے اس کی لمبی زندگی پر رشک آیا۔

گلی میں محلے کا موچی ہر آنے جانے والے کے جوتوں کی طرف نظر ڈالے کسی گاہک کا منتظر تھا۔ موچی کو دیکھ کر اس کو ترس آتا تھا۔ غریب کو چھ جوان لڑکیاں تھیں۔ آج اس نے اپنے دل میں موچی کے تئیں ہمدردی کی کوئی کسک محسوس نہیں کی اور موچی کے سلام کا جواب دیئے بغیر اپنی الجھنوں میں الجھا آگے بڑھ گیا۔ ''اس کو کیا پتہ ہے کہ آج میں نے کتنی بڑی بری خبر سنی ہے اور میں کس ذہنی عذاب میں مبتلا ہوں۔''

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک دفعہ اور مصمم ارادہ کیا کہ وہ بیوی پر اپنی پریشانیاں ظاہر ہونے نہیں دے گا۔ اس نے اپنے دماغ سے موت کا خیال کھرچ پھینکا۔ لیکن بیوی اور بچی کا چہرہ دیکھتے ہی وہ جذباتی بن گیا اور اس کے دل میں ان کی محبت عود کر آئی۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟" بیوی نے بے تابی سے پوچھا۔

"معدے کی بیماری ہے۔ پرانی ہوگئی ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"میں کہتی تھی نا؟ آپ ٹھیک طرح علاج کرائیں۔ آپ تصویریں بنانے میں یوں مگن رہتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کا خیال نہیں رہتا۔"

وہ چپکے سے بستر پر دراز ہو گیا اور اپنی کوفت کو چھپاتے ہوئے بولا۔ "فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ لیکن بیوی کے سامنے اپنے دلی کرب کو خوبصورتی سے درد کا لبادہ پہناتا رہا۔

رات کئی بار نیند سے جاگا۔ جب بھی آنکھ کھلتی تو سب سے پہلے ڈاکٹر کے الفاظ "آپ کو معدے کا کینسر ہے۔" اس کے دماغ میں گھس آتے۔

اسی عالم میں وہ صبح تڑکے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ موقلم اور برش سنبھالے اور بورڈ کے سامنے کھڑا ہوا۔ کینوا اس کے سامنے ایک انسان کی شبیہ ابھرتی گئی۔

تصویر دیکھ کر اس کی بیوی بولی۔ "یہ کس سنکی کو بنایا ہے؟"

"سنکی؟"

"ہاں رونی صورت، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال اور مریل جسم۔ کینسر کا مریض لگتا ہے۔"

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

بیوی نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ ناشتہ کے بغیر وہ ڈاکٹر کے چلا گیا۔ ڈاکٹر اس کا جانا پہچانا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا میں تین ماہ تک زندہ رہ سکوں گا؟'' اس نے جاتے ہی یہ سوال داغ دیا۔

ڈاکٹر چونک پڑا۔

''میں اس مدت کے دوران چند شاہکار تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ یہ شاہکار تصویریں مجھے شہرت دیں گی اور مدت تک میری بیوی اور بچی کی کفالت کریں گی۔''

''آپ تین ماہ کیا، تین سال کیا، تیس سال زندہ رہیں گے۔'' ڈاکٹر بولا۔ ''کل آپ نے میری بات پوری سنی نہیں۔ میں نے کلینک سے باہر آکر آپ کو دو تین مرتبہ پکارا۔ شاید آپ نے سنا نہیں۔ آپ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ابھی آپ کی بیماری کا پہلا اسٹیج ہے۔ آپریشن سے ٹھیک ہوسکتا ہے۔ میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا تھا کہ آپ علاج معالجے میں سستی نہ کریں۔ اس لیے بیماری کی نوعیت آپ سے چھپائی نہیں۔ ویسے بھی نئے ریسرچ کی روشنی میں یہ دریافت ہوئی ہے کہ کینسر کا جو مریض یاسیت کا شکار ہوتا ہے وہ جلدی مرجاتا ہے۔ جو تفکرات کو بھول جائے اور زندگی سے مایوس نہ ہو، وہ ٹھیک ہوجاتا ہے۔ آپ رجائی بنیں۔ امنگیں جوان رکھیں اور ہمت سے کام لیں۔ آپ جلدی ٹھیک ہوجائیں گے۔''

ڈاکٹر کے الفاظ پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ سے ایک استدعا ہے کہ میری بیوی کو اس بیماری کا علم نہ ہو۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔'' ڈاکٹر بولا۔

''عاصمہ! ایک کپ کافی؟'' اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے مسکرا کر بیوی سے کہا۔

''اوکے!'' اس کی بیوی نے مسکرا کر چولہے پر کیتلی چڑھائی۔

(آج کل، نئی دہلی)



آزمائش

''اس بچے کو دیکھیے۔ اس کے ماں باپ کی کیا حالت ہوگی۔'' ریل کے کمپارٹمنٹ میں اپنے پہلو میں بیٹھے آدمی کو اخبار دکھاتا ہوا ایک مسافر بولا۔

''اس دنیا میں کیسے کیسے سنگ دل اور ذلیل لوگ ہیں۔ شاید پیسے کے لیے بچے کا اغوا کیا ہوگا۔'' اخبار دیکھ کر پہلو کا مسافر بولا۔

''اشتہار کے مطابق بچے کو کھوئے چار روز ہوئے ہیں۔'' پہلا مسافر بولا۔

اخبار دوسرے کے ہاتھوں میں پہنچا اور وہ مسافر بولا۔ ''میں نے کل اخبار میں اس گمشدہ بچے کا اشتہار دیکھا— بڑا خوبصورت، بھولا بھالا معصوم بچہ ہے— بالکل اس بچے کا ہم عمر لگتا ہے۔'' اس نے پاس ایک عورت کی گود میں بیٹھے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''تصویر کا بچہ تو کھلکھلا کر مسکرا رہا ہے لیکن یہ روٹھا روٹھا لگتا ہے۔'' ایک عورت بولی۔

''کیا ہوا ننھے میاں کو؟'' ایک مسافر نے عورت سے پوچھا۔

عورت نے اپنے سر کو یوں ہلکی سی جنبش دی گویا اس کو اس کا علم نہیں ہے۔

''کچھ تو بات ہے۔'' عورت کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے کہا۔ ''بڑا ناراض لگتا ہے چھوٹے میاں، اس کو مناؤ تو؟'' عورت کی گھگھی بندھ گئی۔

''صبح سے اس کی طبیعت خراب ہے۔'' عورت کے پہلو میں بیٹھا ہوا مرد بولا اور بیگ میں سے ایک بسکٹ نکال کر بچے کو کھلانے لگا، لیکن بچے نے نہیں کھایا۔

اخبار یکے بعد دیگرے کئی مسافروں کے پاس پہنچا۔ ایک بولا۔ ''پچھلے سال ہمارے محلے

میں ایک بچہ کھو گیا تھا۔ دو روز بعد اس کی لاش ملی۔ تب سے بچے کی ماں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔''

مرد اور عورت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا اور دوسرے اسٹیشن پر دونوں اتر گئے۔

بچہ پاپا اور ممی کہتا ہوا رونے لگا۔ دونوں اسے منانے لگے۔

مرد نے عورت سے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی تمہیں کہا تھا کہ ہمیں بڑی مصیبت آ سکتی ہے۔ شکر کرو کہ گاڑی میں بچہ نہیں رویا۔''

''میرا تو دل بیٹھ گیا تھا۔'' عورت بولی۔

دونوں کھیتوں کے کنارے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہمارا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟'' مرد نے پوچھا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کم سے کم بیس کلومیٹر دور ہونا چاہیے۔'' مرد بولا۔

بچہ زور زور سے رونے لگا۔ ''میں پاپا جاؤں گا، ممی جاؤں گا۔''

مرد بولا۔ ''اس سے پہلے کہ ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں، ہمیں بچے کو واپس کرنا چاہیے۔''

''یہ میرا اپنا بچہ ہے، مجھے اپنا کھویا ہوا بچہ واپس ملا ہے۔'' عورت چلائی۔

شوکت میاں کے گھر میں رشتہ دار، احباب اور ہمسائے جمع تھے۔ نمناک آنکھوں سے شوکت میاں نے بتایا ''بچہ بڑا چلبلا ہے۔ میلے میں چند لمحوں کے لیے ہم سے الگ ہو گیا اور یوں غائب ہوا کہ ہاتھ نہیں آیا۔ بہت تلاش کیا لیکن نہیں ملا۔ آخر پولیس میں رپورٹ کی۔''

نکہت خانم پر تو قیامت ٹوٹی تھی۔ دوپہر سے وہ دو مرتبہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

وہ ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ بہت دعاؤں اور منتوں کے بعد خدا نے عطا کیا تھا اور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش ہو رہی تھی۔

شوکت میاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ ہمارے لیے ایک نیا مہمان بن کر گھر آیا

تھا۔ اس کی وجہ سے گھر میں رونق تھی۔ ہم اس کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔''

دیوار پر ٹنگی ہوئی بچے کی تصویر دیکھ کر سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

محلے کے کئی نوجوان جائے وقوع پر گئے، ہر کس و ناکس سے پوچھا۔ اتنا معلوم ہوا کہ ایک عورت اور ایک مرد ایک روتے ہوئے بچے کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ حلیہ اور وضع قطع سے مرد اور عورت مجرم نہیں لگتے تھے۔

ایک پڑوسی بچے کی تصویر لے کر اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک اخبار کے دفتر گیا۔

ہر بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اس امید سے چونگا اٹھایا جاتا کہ بچے کی بازیابی کی اچھی خبر ہو، لیکن فون کرنے والا خود بچے کے متعلق دریافت کرتا تھا۔ کسی نے کہا کہ ٹیلی فون کا چونگا اٹھا کر رکھ دے لیکن ایک بزرگ نے منع کرتے ہوئے کہا کہ بچے کی گمشدگی میں کسی اغوا کار کا کرتوت ہو تو وہ شاید فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ اس بزرگ نے دیوار پر ٹنگی بچے کی تصویر ہٹوائی۔ نکہت خانم نے تصویر دیکھ کر چیخ ماری اور ان پر بے ہوشی کا عالم طاری ہوا تھا۔

رات آئی تو شوکت میاں نے کہا۔ ''ہم اس وقت اس کو کھانا کھلاتے ہیں۔ وہ کبھی کھانا نہیں کھاتا ہے اور دودھ نہیں پیتا ہے تو ہم ٹی وی کھول دیتے ہیں اور وہ کارٹون دیکھتا ہے اور ہم نرم گرم الفاظ کہہ کر اس کو کھانا کھلاتے اور کہتے اگر کھانا نہیں کھائے گا اور دودھ نہیں پیئے گا تو ہم ٹی وی بند کر دیں گے اور وہ ہماری بات مان لیتا تھا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا اور کس حالت میں ہوگا۔'' شوکت میاں نے ایک لمبی آہ بھری۔

میاں بیوی نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح جب نکہت خانم کی نظر بچے کے کھلونوں اور کپڑوں پر پڑی تو ان پر غشی طاری ہوئی۔ شوکت میاں نے وہاں موجود لوگوں کو بچے کے کھلونوں میں سے ربڑ کی ایک مرغی دکھاتے ہوئے کہا۔

''ایک روز نوکر مرغی ذبح کر رہا تھا۔ بچے نے دوڑ کر یہ کھلونا لایا اور چلا کر کہا مرغی کو نہیں مارو۔ اسے مارو۔'' شوکت میاں آبدیدہ ہوا۔

اصرار کے باوجود شوکت میاں اور نکہت خانم نے ناشتہ نہیں کیا۔

''ہم دانش کے بغیر ناشتہ کیسے کریں؟ وہ ناشتے میں 'پورج' ایک اُبلا ہوا انڈا اور جوس کا ایک گلاس پیتا تھا۔ بیٹے کے بغیر پیٹ میں ایک نوالہ بھی نہیں جائے گا۔'' شوکت میاں بولے۔

''شوکت! ظاہر ہے دانش کو کسی عادی مجرم نے اغوا نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس نے اب تک روپیہ کے عوض یرغمال بچے کی رہائی کے لیے ضرور رابطہ قائم کیا ہوتا۔'' شوکت کے ایک دیرینہ دوست سمیع اللہ نے کہا۔

شوکت میاں بولے۔'' خدا کرے بچہ کسی ایسے ظالم بھکاری کے ہاتھ نہ پڑا ہو جو بچوں کو اغوا کر کے انہیں اپاہج بنا دیتا ہے اور پھر بھیک منگواتا ہے۔ یہ فکر مجھے کھائے جا رہی ہے۔ نکہت کو اس بات کا علم نہیں۔ اگر اس کو پتہ ہوتا تو اس کی حالت اور بھی دِگر گوں ہو جاتی۔''

تین روز گزر گئے۔ بچے کی کوئی خبر نہیں سنی۔ نکہت خانم بیمار بستر پر دراز تھی۔ شوکت میاں نے اب تک اپنا حوصلہ قائم رکھا تھا۔ اب ان کے اعصاب جواب دے رہے تھے اور رہی سہی ہمت ختم ہو گئی تھی۔ رشتہ داروں اور یار دوستوں کے پاس انہیں دلاسہ دینے کے لیے اب الفاظ بھی نہیں رہے تھے۔

چوتھے روز سہ پہر کو کسی نے یہ خبر سنائی کہ ایک مرد اور عورت ایک بچے کے ہمراہ ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھے گئے۔ بچے نے وہی لباس اور ٹوپی پہنی تھی جس کا شوکت میاں نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا تھا۔ بچہ غمگین نظر آتا تھا۔ مرد اور عورت متوسط طبقے کا ایک جوڑا لگتا تھا۔

بعد میں تینوں ٹرین پر سوار ہوئے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی منزل کہاں تھی۔

مرد نے عورت سے کہا کہ بچہ بیمار ہے۔ کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ اس کے ماں باپ کا برا حال ہو گا۔ ہمیں اسے اس کے وارثوں کے حوالہ کرنا چاہیے۔

''نہیں نہیں؟ یہ میرا بچہ ہے، میں کسی کو نہیں دوں گی۔'' عورت بولی۔

''یہ ہمارا بچہ نہیں ہے۔''

''ہمارا بچہ ہے۔'' عورت چیخی۔

''ہم کسی یتیم خانہ سے اپنی پسند کا ایک بچہ گود لے لیں گے۔''

''مجھے کوئی اور بچہ نہیں چاہیے۔ یہی میرا بچہ ہے۔ اگر کوئی اسے مجھ سے چھین لے تو میں

مرجاؤں گی، زہر کھالوں گی۔"

عورت پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوئی۔

ان کا اکلوتا بچہ لگ بھگ ایک سال پہلے اچانک غائب ہوا تھا۔ سارا قصبہ چھان مارا، پولیس کو رپورٹ دی لیکن بچے کا کوئی اتہ پتہ نہیں چلا۔

ایک پڑوسی کو شک ہوا کہ بچہ کہیں اس کنوئیں میں تو نہیں گرا جسے زیرِ تعمیر مکان کے لیے پانی جمع رکھنے کے لیے عارضی طور پر مکان کے احاطہ میں کھودا گیا تھا اور اسی کنوئیں سے بچے کی نعش برآمد ہوئی۔ اس جانکاہ سانحہ کے بعد عورت پر گاہے بہ گاہے دورہ پڑتا تھا۔ مغویہ بچے میں عورت کو شاید اپنے بچے کا عکس نظر آیا۔ وہ اس کو اپنا بچہ کہتی تھی۔

لیکن ٹرین کے تجربے کے بعد میاں بیوی خوفزدہ تھے۔ وہ گاؤں ٹرین یا بس میں سفر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک آٹو پکڑا۔ بچہ رو رو کر نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

رات دیر گئے وہ گاؤں پہنچے۔ بچے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے چند لمحوں کے لیے اجنبی مرد اور عورت کو دیکھا۔ پھر یک لخت اس کا چہرہ فق ہوا اور پاپا اور ممی کہتا ہوا زور زور سے رونے لگا۔

"ہم کب تک اس کو چھپا کر رکھیں گے۔" مرد بولا۔ "ایک دن تو پتہ چل جائے گا اور پھر ہم سیدھا جیل جائیں گے۔ میں کل صبح اس کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، میں بچے کو نہیں دوں گی۔" عورت چیخی۔ "میں مرجاؤں گی۔ خودکشی کرلوں گی۔"

عورت کی حرکات اور غصہ دیکھ کر بچہ سخت سراسیمہ ہوا اور بھیگی بلّی بن گیا۔

ان چار دنوں میں بچہ بڑا کمزور ہو گیا تھا۔

صبح ایک پڑوسن نے بچے کو دیکھا تو بولی۔ "دیدی! کس کے بچے کو لائی ہو؟ سُتا سُتا چہرہ، تمہارا لاڈلا تو نہیں لگتا ہے۔"

دوسری عورت نے تائید کی۔ "یہ کیوں اداس اداس ہے؟"

میاں بیوی دونوں گھبرا گئے۔ عورت کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بچے کو اندر لے گئی۔

''میں بچے کو لے جاتا ہوں۔'' مرد بولا۔

عورت نے مزاحمت نہیں کی۔ مرد نے اطمینان کا سانس لیا۔

بچے کو چمکارا اور کہا۔ ''کاکا اٹھو، میں تمھیں تمہارے پاپا اور ممی کے پاس لے جاتا ہوں۔''

بچے کے چہرے پر ہلکی سی چمک آئی۔

وہ پولیس تھانہ جانا نہیں چاہتا تھا اور نہ اپنا سیل فون استعمال کرنا چاہتا تھا، جو اس کو سیدھا قانونی گرفت میں لا سکتا تھا۔ اس نے ایک اخبار کے دفتر کی راہ لی جہاں پاس ہی ایک ٹیلی فون بوتھ تھا۔

ادھر شوکت میاں کو رات بھر کی بے خوابی کے بعد ہلکی سی نیند آ گئی تھی۔ بیوی اسپتال میں تھی۔ شوکت میاں نے خواب دیکھا۔ دو خوفناک کریہہ شکل کے آدمی ان کے بچے کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ بچہ حد سے زیادہ کمزور نظر آ رہا تھا۔

''دانش!'' شوکت میاں چلائے اور بچے کے پیچھے دوڑے۔

بچے نے مڑ کر ایک لمحے کے لیے شوکت میاں کی طرف دیکھا۔ مخالف سمت سے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ وہ دو خوفناک آدمی بچے کو چھوڑ کر فرار ہوئے۔ شوکت میاں بچے سے لپٹ کر رونے لگے۔ ایسے میں ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

''میرے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں۔'' شوکت میاں زور زور سے رونے لگے۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شوکت میاں نے کانپتے ہاتھ سے فون اٹھایا اور لرزتی آواز میں ہیلو کہا۔

ایک اجنبی آواز کہہ رہی تھی کہ اخبار 'جہاں' کے دفتر میں ان کا بچہ صحیح سلامت موجود ہے۔

(ایوانِ اردو، دہلی)

OO

رازِ دل

''ریتا! وہ سرخ سرخ گالوں والا بچہ دیکھ رہی ہو؟''

''وہ جو کیاری کے سامنے کھڑا ہے؟''

''نہیں، کیاری سے آگے۔ کھمبے کے پاس!''

''ہاں تو؟'' ریتا نے اپنے شوہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ وہی بچہ ہے جس کو چودھری صاحب نے گود لیا ہے۔''

ریتا کے سراپا میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑی اور اپنی آنکھیں پھیلائے بچے کی طرف دیکھنے لگی۔

بچہ دوڑتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا۔ سفید قمیص، نیلے نیکر اور سرخ ٹائی میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

ریتا اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہی جب تک شیشم کے پیڑوں کی اوٹ میں وہ غائب ہوا۔

''اس کی آنکھیں بالکل ہماری انجو کی طرح ہیں۔'' ونود بولا۔

ریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بار بار شیشم کے پیڑوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک لیے۔

ریتا کے ذہن میں سات سال پہلے کی ایک خبر کی سرخی گھومنے لگی جو مقامی روزنامہ ''جہاں نما'' میں ''کنواری کا گناہ'' کے عنوان سے یوں چھپی تھی۔

''ہسپتال جانے والی سڑک پر کل شام ایک زندہ نوزائیدہ بچہ پایا گیا جو ایک سپید کپڑے میں لپٹا دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ یہ معصوم بچہ ایک کنواری ماں کا گناہ لگتا ہے۔ پولیس معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے۔''

اس کے کچھ عرصہ بعد ''جہاں نما'' میں یہ خبر چھپی ''گزشتہ روز سڑک پر پائے جانے والے نوزائیدہ بچے کو شہر کے سرکردہ رئیس چودھری کرم چند نے گود لیا ہے۔ انہوں نے یہ بچہ یتیم خانہ سے حاصل کیا۔ چودھری صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''آؤ، گھر چلیں۔'' ونود نے ریتا کی محویت کو توڑا۔ دونوں اپنی بچی کو نرسری میں داخلہ دلانے کے لیے کنونٹ آئے تھے۔

کار سڑک پر فرائے بھرنے لگی۔ راستہ بھر ریتا کچھ نہیں بولی۔

ونود بھی خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ریتا بڑی حساس ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ریتا دل ہی دل میں اپنے غم ناک ماضی کے اوراق اُلٹ رہی تھی۔

وہ دن اس کے لیے بہت بُرا تھا۔ جب وہ پونیت کے ساتھ پکنک پر گئی تھی اور اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ پونیت کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی۔ اس روز موسم بڑا سہانا تھا اور نظارہ بڑا دلکش تھا۔ ریتا کا دل محبت کے لطیف اور نازک جذبات سے معمور تھا، ہوس پرستی کی بھسم کر دینے والی آگ سے نہیں۔ پونیت پر کیا ہوس سوار ہوئی، ریتا کو میٹھی میٹھی باتوں سے پھسلانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ریتا نہیں مانی تو وہ اوچھے پن پر اُتر آیا۔

اس کے پیٹ میں نادانستہ طور پر ننھی سی زندگی پلتی رہی اور جب انکشاف ہوا تو اس کا پیٹ اونچا ہو چکا تھا۔ دو دفعہ اس کو لبِ دریا سے پکڑ کر لایا گیا۔ وہ اپنے آپ کو دریا میں غرقاب کر دینا چاہتی تھی۔ ایک مرتبہ سڑک پر گاڑی کے سامنے لیٹ گئی، پر موت نہیں آنی تھی، نہیں آئی۔ اس کے بعد رات دن اس پر کڑی نگرانی رکھی گئی اور ایک روز ریتا کی کوکھ سے جنم پانے والی زندگی سڑک پر پائی گئی۔ اس کے والدین کے علاوہ ان کا خاندانی ڈاکٹر منچندا اس کا راز دان تھا۔ یہ ونود ہی تھا جس نے اس کو نئی زندگی عطا کی۔ ورنہ وہ بالکل بکھر کر رہ گئی تھی۔ اس کا

پورا وجود ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ پونیت کی طرح ونود بھی ریتا سے پیار کرتا تھا۔ تینوں یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے تھے لیکن پیار کی اس دوڑ میں پونیت نے ونود کو پچھاڑ دیا تھا۔ ستم ظریفی تھی کہ سب کچھ جیت کر بھی پونیت ہار گیا تھا۔ ونود نے اڑتی سی خبر سنی تھی کہ پونیت نے ریتا کے ساتھ بالادستی کی تھی اور وہ پیٹ سے ہے لیکن اس نے ریتا سے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اس سے متعلق بھولے سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ پیار اور ہمدردی کا ایک ملا جلا احساس اس کو ریتا کے قریب لایا تھا اور اسی سے بھرپور محبت کا اظہار کیا تھا۔ ریتا نے پیار کے یہ الفاظ ونود کی زبان سے بارہا سنے تھے۔ قند و شکر میں ملی ہوئی محبت کی لچھے دار باتوں سے اس کو نفرت تھی اور شادی کے نام سے چڑ تھی۔ اس حادثے کے بعد اس کی سوچ میں گہری تبدیلی آئی تھی۔

ونود بار بار رسانیت سے کہتا۔ ''ریتا، تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے'' یا تو اس کی ماں کا اصرار تھا یا ونود کی گہری اپنائیت کا جادو۔ ریتا آخر کار ونود کی ہو گئی۔

ان کی شادی کو اب چھ سال ہوئے تھے۔ ونود نے اس دوران اس کے زخموں پر بار بار پھاہا رکھا۔ شادی کے ایک سال بعد انہیں ایک بچی بھی نصیب ہوئی۔ ریتا کا زخم مندمل ہو چکا تھا لیکن بچے کو دیکھ کر اس کا زخم پھر تازہ ہوا۔ اس بچے نے اس کی زندگی میں زہر انڈیل دیا تھا۔ اس کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ لیکن آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی یہ بچہ اس کے دل سے کبھی اوجھل نہیں ہوا تھا۔ بچے کے جنم کے پانچ سال بعد اس نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ بچے کو چودھری کرم چند نے گود لیا ہے۔ لیکن کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے روز انجو کو لے کر ریتا اکیلی کنونٹ گئی۔ بچے کو دیکھ کر اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کی ممتا جاگ اٹھی۔ اس معصوم بچے کا آخر کیا قصور ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے آخر اس کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے اور اس کی فریب خوردہ محبت کی نشانی ہے۔

اس کے دل میں بچے کی محبت کا جذبہ عود کر آیا۔ اس نے نام پوچھا۔ اپنے سینے سے لگایا اور اس کے نین نقش میں اپنا عکس ڈھونڈنے لگی۔

تیسرے روز جب وہ انجو کو لے کر کنونٹ گئی تو اس نے بچے کو اپنے پاس بلا لیا اور انجو سے اس کو ملاتے ہوئے کہا۔

''انوپ! یہ انجو ہے تمہاری بہن۔''

غیر ارادی طور پر ریتا کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔

جب وہ دوبارہ انجو کو لینے گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ انوپ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ جب انوپ نے اس کو آنٹی کہہ کر پکارا تو اس نے پیار سے کہا۔ ''آنٹی نہ کہو۔ مجھے ممی کہو۔''

''آج میں کاکا کو چودھری صاحب کے ہاں خود پہنچا دوں گی۔'' ریتا نے چودھری کرم چند کے ڈرائیور سے کہا۔

ریتا نے بچے کو کار میں بٹھایا اور چودھری صاحب کی کوٹھی پہنچا دیا۔ انوپ نے اصرار کیا کہ وہ اس کے پاپا اور ممی سے مل کر جائیں۔ ریتا نے یہ کہہ کر پنڈ چھڑایا کہ وہ پھر کبھی ان سے ملیں گی۔

اس دن کے بعد انوپ، انجو کے ساتھ کبھی کبھی اس کے گھر آنے جانے لگا۔

ایک روز ونود ایک دعوتی رقعہ لایا۔ ریتا گھر پر نہیں تھی۔ جب وہ لوٹی تو ونود نے ریتا کی طرف رقعہ اچھالتے ہوئے کہا۔

''ریتا، کل چار بجے ہمیں چودھری صاحب کے ہاں جانا ہے۔ انوپ کی سالگرہ ہے۔''

ریتا استفہامیہ نظروں سے ونود کو دیکھنے لگی۔

''کیوں جاؤ گی نا؟''

''میں نہیں جاؤں گی تم اور انجو چلے جاؤ۔''

''وہ لوگ برا مانیں گے۔ تمہیں جانا چاہیے۔''

''تم کہہ دینا کہ میری طبیعت خراب ہے۔''

''تمہاری مرضی بھئی۔'' ونود کچھ توقف کے بعد بولا۔

پھر ریتا نے اچانک سوال کیا۔ ''انہوں نے بچے کی تاریخ پیدائش کیا دی ہے؟''

''واہ، کیا دلچسپ نکتہ اُبھارا ہے۔'' ونود مسکرایا۔ ''تمہیں ہمیشہ دور کی سوجھتی ہے ریتا۔''

ریتا نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''۱۰/۱۰ اکتوبر ہے۔ شاید اس تاریخ کو انہوں نے بچے کو گود لیا تھا۔'' ونود نے کارڈ دیکھ کر کہا۔

ونود اور چودھری صاحب کے درمیان پہلے تعلقات سلام کلام تک محدود تھے لیکن انوپ اور انجو کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

ایک دن چودھری صاحب نے دونوں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس مرتبہ ریتا انکار نہیں کر سکی۔

چودھری کرم چند، ان کی بیوی، ریتا اور ونود لان میں بچھائی کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انجو اور انوپ لان کے پاس کھیل رہے تھے۔ ایک دفعہ ان کی گیند اچھل کر چودھری صاحب کے پیر سے لگی۔ انوپ گیند کا پیچھا کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ جب وہ گیند لے کر چلا گیا تو چودھری صاحب بولے۔ ''مجھے اس بچے سے متعلق سب سے بڑی فکر یہی رہتی ہے کہ اس کو اپنی اصلیت کا پتہ نہ چلے۔ کوئی اس کی ولدیت کا ذکر کر کے اس کو آزردہ نہ کرے اور بھولے سے بھی اس کے کان میں یہ بھنک نہ پڑے کہ وہ سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔''

''اور تو کوئی نہیں، اسکول میں کوئی شریر لڑکا ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔'' ونود بولا۔ ''انہیں ایک دوسرے کو چڑانے کی عادت ہوتی ہے۔''

''یہ خوش نصیبی ہے۔'' چودھری بولے۔ ''ابھی تک میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی۔ اگر وہ حقیقت جان لے گا تو اس کے ذہن پر نفسیاتی طور پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس کے لیے ہم ہی ماں باپ ہیں۔''

ریتا کچھ نہیں بولی۔

ونود بولا۔ ''اس کی ماں اس دنیا میں ہو تو بڑی مطمئن ہوگی۔''

''ایشور جانے وہ کون ہے اور کہاں ہوگی؟'' مسز چودھری نے مسکرا کر کہا۔

ریتا کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ انوپ کو دنیا بھر کی آسائشیں حاصل ہیں۔

ماہ و سال گزرتے گئے۔ انوپ نے کالج جوائن کیا اور انجو نے زنانہ کالج میں داخلہ لیا۔

کالج سے فارغ ہو کر دونوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ انوپ اب ایک گبرو جوان تھا اور انجو اپنے دلکش خدوخال اور پُرکشش شخصیت کے لیے یونیورسٹی میں بڑی مقبول تھی۔

اب ریتا کی کنپٹیوں پر سفید بال آ گئے تھے۔ دونوں کا میل جول اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ کئی مرتبہ اس نے انجو سے سب کچھ صاف صاف کہہ دینے کا ارادہ کیا لیکن ہر دفعہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر تھرتھرا کر رہ گئے۔

ایک روز ونود نے ریتا سے کہا۔ ''ریتا! انوپ اور انجو کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ کیا تم ان کی نگاہوں کی باتوں کو سمجھتی ہو؟''

ریتا اس رات سو نہیں سکی۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ پچھلے اُنیس سال سے وہ اس راز کو اپنے سینے میں پال رہی تھی۔ لیکن اب وہ اسے مزید چھپائے نہیں رکھ سکتی تھی۔

صبح جب انوپ انجو کو بلانے آیا تو ریتا نے انجو کو روک لیا۔

ریتا کا چہرہ سُتا سُتا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مہینوں سے بیمار ہے۔

ریتا نے انجو سے کہا کہ وہ انوپ سے ملنا فوراً بند کر دے۔

ونود اور انجو دونوں حیرت سے ریتا کا چہرہ تاکنے لگے۔

''ممی، آخر کیوں؟'' انجو نے احتجاج کیا۔

''انجو، انوپ تمہارا بھائی ہے۔'' اور ریتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(بیسویں صدی، نئی دہلی)



ایک رات

آنگموں اور صنم کی زندگی میں یوں تو ہزاروں سہانی راتیں آئیں۔ لیکن وہ ایک رات عظیم تھی جب دو اجنبی بستیوں کے دو اجنبی دل ہم آہنگ ہوئے اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے۔

سردی سے بھیگی ہوئی برف آلود رات تھی۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سامنے دیو پیکر بلند برفانی پہاڑ تاریکی میں گم صم کھڑا تھا اور پاس ہی کہیں سے دبیز یخ کے نیچے سے پانی کراہ کراہ کر بہہ رہا تھا۔

اچانک اس سناٹے میں دستک کی آواز سنائی دی اور سامنے زنجیر سے بندھا ہوا نیم خوابیدہ کتا جاگ اُٹھا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ دور دور کے کتوں نے اس کا ساتھ دیا۔ دستک اونچی ہوتی گئی اور تاریکی میں لپٹے ہوئے مکان کے دریچے سے جہاں سے ہلکی سی روشنی رہی تھی، ایک نسوانی آواز آئی۔

"کون ہو؟"

"میں ایک پردیسی ہوں۔ ایک رات کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔" ایک جوان مردانہ آواز نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ نیم تاریکی میں دس بارہ سالہ چھوٹے لڑکے نے ایک ٹمٹماتا ہوا دیا دکھاتے ہوئے کہا۔ "پردیسی اندر آجایئے۔"

وہ چپکے سے پیچھے ہولیا۔ کمرے میں الاؤ جل رہا تھا۔ اس کے گرد ایک خاتون، چھ سات

سال کا ایک گول مٹول بچہ اور ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں استعجاب اور سراسیمگی تھی۔ پردیسی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور الاؤ کے قریب جنگلی ہرن کی کھال پر بیٹھ گیا۔ اس کی سیمابی نگاہیں کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی سب کے چہروں سے پھسل کر لڑکی کے چہرے پر آٹکیں۔ چند لمحوں کے لیے آنکھیں دو چار ہوئیں۔ کتنی حسین ہے! نوجوان نے دل ہی دل میں تعریف کی۔

قیمتی فرکوٹ میں ملبوس، گلے سے سرخ مفلر لگائے اور سیاہ بالوں کی لٹیں سپید ماتھے پہ جھلائے۔ نوجوان بھی بڑا وجیہہ لگتا تھا۔

''اس بھیانک رات میں تم یہاں کیسے بیٹا؟'' ادھیڑ عمر کی عورت نے جس کی آنکھوں میں کچھ لمحہ پہلے سراسیمگی تیر رہی تھی، ملائمت سے پوچھا۔

نوجوان نے الاؤ پر ہاتھ تاپے، ایک آہ سی بھری اور بتانے لگا کہ وہ چند دوستوں کے ہمراہ کوہ پیمائی کی ایک مہم پر نکلا تھا اور لاسیر کی چوٹی سر کرتا ہوا وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ واپس آتے ہوئے رات سر پر آئی اور ان کے گاؤں میں پہنچا۔

نوجوان نے محسوس کیا کہ اس کی باتیں سن کر لڑکی کی آنکھوں میں ہمدردی کی ایک لہر آئی ہے۔

''آپ کا گھر کہاں ہے بیٹا؟'' عورت نے پوچھا، جو بچوں کی ماں تھی۔

''میں خرچین کا رہنے والا ہوں ماں۔ کیا آپ نے خرچین دیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔ میں نے تو صرف نام سنا ہے!''

''مجھے کسی نے بتایا کہ خرچین آپ کے گاؤں کے سامنے کے اونچے گلیشیئر کے بالکل پیچھے واقع ہے۔'' نوجوان بولا۔

''لیکن راستے سے بہت دور پڑتا ہے۔''

''جی ہاں، چار پانچ روز کا سفر ہے۔''

''قریب آجاؤ بیٹا، ٹھیک طرح سے آگ تاپنا۔'' عورت بولی اور بڑے لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''داوا! ان کو کمبل اوڑھنا اور لڑکی سے بولی، تم باہر سے سوکھی لکڑیاں لانا۔''

بڑے لڑکے نے پردیسی کے پیچھے کمبل اوڑھا دیا۔

''شاباش بھئی داوا۔ آج بڑی سردی لگی۔'' نوجوان بے تکلفی سے بولا اور چھوٹے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بچوں کی ماں سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''آپ کے بچے بڑے پیارے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر ایک لمحہ کے لیے لڑکی کے چہرے پر پڑیں جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لڑکی نے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

''جی ہاں۔'' عورت نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہ میرا بڑا بیٹا داوا ہے۔ یہ ٹشی ہے اور یہ ان کی آپا آنگموں ہے۔''

آنگموں نے اپنی اٹھی ہوئی نظریں نیچی کیں۔

''بچوں کے باپ کہاں ہیں؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''وہ آج صبح پاس کے گاؤں گیا ہے۔ کل شام واپس لوٹے گا۔ پھر ماں آنگموں سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''آنگموں، ان کے لیے کھانا بنانا، انہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔''

آنگموں نے خاموشی سے چولہے پر ہنڈیا چڑھائی۔

''نہیں ماں اتنی بھوک تو نہیں۔'' نوجوان بولا۔ ''اس سردی میں کھانے سے کہیں زیادہ آگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔''

''بیٹا تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟'' ماں نے تانبے کی منقش چائے دانی سے چاندی کی پیالی میں نمکین چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے صنم کہتے ہیں ماں۔ صنم چھرنگ۔''

''صنم چھرنگ۔ یعنی خوش نصیب لمبی عمر والا، خدا تمہیں لمبی عمر دے۔''

نوجوان مسکرایا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رینگی۔ جیسے ان ہونٹوں نے سرگوشی کی ہو۔

''ماں باپ کے کتنے خوبصورت لاڈلے بچے ہیں۔'' نوجوان دوبارہ بولا۔

''ہاں بیٹا، ابا نے بڑے لاڈ پیار سے پال پوس کر انہیں بڑا کیا ہے۔'' ماں نے غنائیت سے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور نوجوان سے سوال کیا۔

''تمھیں ماں باپ ہیں بیٹا؟''

''جی ہاں!''

''باپ کیا کرتے ہیں؟''

''وہ خرچین میں ڈاکٹر ہیں ماں!''

''بہن بھائی ہیں؟''

''دو بہنیں ہیں اور دو چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک تو اپنے ٹشی کے برابر ہے۔ بالکل ٹشی کی طرح گول مٹول اور من موہنا چہرہ۔''

''بہنوں کی شادیاں ہوئی ہیں؟''

''بڑی کی ہوئی ہے۔ چھوٹی تو داوا کے برابر ہے۔''

بات چیت نے بے تکلّفانہ رنگ اختیار کیا۔ اجنبیت ختم ہوگئی۔ ایک دوسرے کے گھریلو نقشے آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ ٹشی نوجوان پردیسی کی گود میں جا بیٹھا۔ پردیسی کی نظر ماں کی آنکھ بچا کر بار بار لڑکی کے چہرے پر پڑتی۔ دو نگاہیں مل جاتیں۔ دو دل دھڑکتے۔

پھر آنگموں نے کھانا پیش کیا اور پردیسی خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''ہماری آنگموں بڑی شرمیلی ہے صنم۔'' ماں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''جب کوئی اجنبی آتا ہے تو اس کے لب سی جاتے ہیں۔''

''حیا عورت کا زیور ہے ماں، کیا یہ گھر پر ہی بیٹھتی ہے؟''

''جی ہاں۔ دسویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔ ابھی نتیجہ نہیں نکلا۔''

ماں جب تھوڑی دیر کے لیے باہر گئی تو نوجوان نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے آنگموں سے کہا۔ ''آج میں نے آپ کے ہاں ایک بادشاہ کا کھانا کھایا ہے۔ آپ بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔''

آنگموں کے سپید دانت چند لمحوں کے لیے جھلملائے اور گھنی پلکیں جھک گئیں۔

ماں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تمھیں نیند تو نہیں آرہی بیٹا؟''

''جی نہیں۔'' قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''کل صبح جانا ہے اس لیے جلدی

سو جاؤں گا۔"

"کل یہاں رُک جائیے۔" ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "دوبارہ ہمارے گاؤں میں پھر کب آئیں گے؟ بچوں کے باپ سے بھی ملو گے۔"

"پہاڑ اور پہاڑ مل نہیں سکتے۔ لیکن انسان اور انسان تو ملتے ہیں۔" نوجوان پردیسی نے اپنے علاقے کی ایک کہاوت کا حوالہ دیا۔ "مجھے یہاں رہتے ہوئے بڑی خوشی ہوگی۔ ننھے ٹشی کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے میرا بھائی نربو بیٹھا ہے۔ داوا مجھے اپنی چھوٹی بہن پد ماں کی یاد دلاتا ہے۔ آنگموں اور آپ نے مجھے اس ایک رات میں اتنا پیار دیا ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ آج صورت حال بالکل الگ ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر میرے ماں باپ کو اس کا علم ہوگا تو ان کی حالت غیر ہو جائے گی۔"

"ہمارے گاؤں میں پھر آپ کہاں آئیں گے؟"

"ماں، میں نے کہا نا، پہاڑ اور پہاڑ نہیں مل سکتے لیکن انسان اور انسان تو ملتے ہیں۔" اس نے کہاوت دہرائی اور اس کی نظریں بے ساختہ لڑکی کے خوبصورت چہرے پر پڑیں، وہ بے خودی سے دیکھتا رہا۔ ماں پردیسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نوجوان نے خفت محسوس کی۔

پھر باتوں نے زیادہ بے تکلفانہ رُخ اختیار کیا۔ گویا ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہوں۔ گویا ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں۔ لڑکی بھول گئی کہ اس کے سامنے ایک اجنبی نوجوان بیٹھا ہے۔ لڑکا بھول گیا کہ وہ انجانے گھر کی ایک اجنبی لڑکی اور اس کی ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ رات گزرتی گئی، سوکھی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جلتی رہیں۔

ایک دفعہ ماں نے پوچھ ہی لیا کہ نوجوان نے شادی کی ہے یا نہیں؟

"جی نہیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

نوجوان تھکا ہوا تھا لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی۔ ایک دفعہ اس نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بجا تھا۔

دوسری صبح جب وہ جاگا تو دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی اور سفید گلیشیئر دھوپ میں

چمک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر اس گلیشیئر کو پھاند سکتا تو وہ نصف دن میں خرچین پہنچ سکتا ہے۔

آنگموں نے اسے ایک دن رُکنے کے لیے کہا۔

''ایک دن کیا میں تو ساری زندگی تمہارے سنگ رہنا چاہتا ہوں۔'' وہ شرارت سے بولا۔

آنگموں کا چہرہ شفق گوں ہو گیا۔

ناشتہ کر کے نوجوان باہر نکلا۔ ماں آنگموں، داوا اور ٹشی اس کے ساتھ باہر آئے۔

''کبھی ہمارے گاؤں آئے، تو ضرور ہمارے پاس آنا۔''

''میں ضرور آؤں گا اور بار بار آؤں گا۔'' اس نے پھر اپنے علاقے کی کہاوت دہرائی اور اس کی نظر غیر ارادی طور پر نقرئی گلیشیئر پر پڑی جو گویا سچ مچ اعتراف کر رہا ہو کہ میں نے بستیوں کو الگ کیا ہے، لیکن انسان کے دلوں کو میں تقسیم نہیں کر سکا ہوں۔

سبھوں سے رخصت لے کر جب وہ پُل کے ناکے پر پہنچا تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سرخ لباس میں ملبوس لڑکی دروازے پر کھڑی تھی۔

درّے کے موڑ پر سے اس نے آخری نظر ڈالی۔ سرخ لباس نظر آیا۔

اس کے گال پر آنسو کا ایک قطرہ ڈھلک آیا، جس کو صرف سامنے کے اونچے گلیشیئر نے دیکھا۔

گھر پہنچ کر صنم نے آنگموں کے گھر شادی کا پیام دیا اور آنگموں کا ہاتھ مانگنے کے لیے رسم کے مطابق جو کی شراب کے دو مٹکے بھی بھیجے۔

(بیسویں صدی، نئی دہلی)



ایک فوٹو

پوسٹ کارڈ سائز کا یہ گروپ فوٹو پانچ پشتوں سے اس خاندان کے پاس تھا۔ بہت سال پہلے موسم گرما کے ایک دن چھوٹے سے کنبے کے بچوں کا باپ یہ فوٹو گھر لایا تھا۔ موروثی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کی طرح یہ فوٹو باپ سے بڑے بیٹے، بیٹے سے پوتے اور پوتے سے پڑپوتے کو ملا تھا۔ پانچ پشتوں تک پہنچتے پہنچتے یہ بلیک اینڈ وہائٹ فوٹو نہ صرف دھندلا ہو گیا تھا بلکہ کناروں سے پھٹ بھی گیا تھا۔

یہ فوٹو ڈوگرہ حکمراں مہاراجہ ہری سنگھ کے جنم دن پر کھینچا گیا تھا اور اس میں لیہ گورنمنٹ مڈل اسکول کے اساتذہ، عملہ کے ارکان اور طلبا تھے۔ اساتذہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دوسرے ملازم اور نیکر اور قمیص پہنے ہوئے، ننگے سر طلبا اساتذہ کے دائیں بائیں پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں بہتوں کے آدھے بدن اور صرف چہرے نظر آرہے تھے۔ پرائمری جماعت کے ننھے منے بچے اساتذہ کے آگے کئی قطاروں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

سلام بٹ نے جو اسکول کا چپراسی تھا، اپنے بیٹے کو فوٹو حوالہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جمال یہ فوٹو سنبھال کر رکھو۔ ہیڈ ماسٹر نے ایک کاپی مجھے دی۔ اس میں تمہاری بھی تصویر ہے۔''

اپنی تصویر دیکھ کر جمال کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ پہلی جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا تھا۔

جمال کو اپنے فارم ماسٹر کے سوا کسی اور استاد کا نام اور اتا پتا معلوم نہیں تھا۔

سلام بٹ جمال کو استادوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ''یہ ہیڈ ماسٹر پنڈت گوبند لال

شاہ ہیں، جو درمیان میں بیٹھے ہیں یہ سیکنڈ ماسٹر پنڈت نیلا کنٹھ ہیں۔ یہ پنڈت شمبو ناتھ، پیارے لال کول اور عربی استاد غلام احمد یانڈے ہیں۔ یہ سارے کشمیر سے آئے ہیں۔ یہ سیّد محمد سعید ہیں اور ہماری مسجد کے امام بھی ہیں۔ یہ غلام حسین بلتی ہیں۔ سکردو، بلتستان کے رہنے والے ہیں۔'' غلام حسین کے سوا سبھوں نے پگڑی باندھی تھی۔ غلام حسین نے دو پہلی ٹوپی پہنی تھی۔ سید محمد سعید اور گوبند لال شاہ کی اچکن سے جیبی گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی۔

تمام لداخی استادوں نے لمبے چوغے پہنے تھے۔ صنم گیالچن، چھوانگ نمگیل اور ٹشی پلجور نے کنٹوپ پہنے تھے۔ اکبر علی، عبدالغنی آخون اور نورالدین کے سروں پر مراکشی سرخ ٹوپی تھی جس پر سیاہ جھالروں کا پھندنا جھولتا تھا۔ یہ رومی ٹوپی کے نام سے جانی جاتی تھی۔

ایک کونے میں سلام بٹ، چوکیدار عبدالقادر اور صنم دورجے خاکروب کھڑے تھے۔

فوٹو میں طلبا سمیت کل ۹۱ /افراد تھے۔

سلاٹ بٹ نے جمال بٹ کو چند سینئر طلبا کے بارے میں بھی بتایا۔

پانچ سال بعد سلام ڈار کا ۵۳ سال کی عمر میں دورانِ ملازمت انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت فوٹو میں موجود تین استاد اور چند کمسن بچے سمیت تیرہ لوگ اس جہاں سے چلے گئے تھے۔ تب جمال بٹ چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر گوبند لال کی سفارش پر جمال باپ کی جگہ چپراسی تعینات ہوا اور تعلیم چھوڑ دی۔

جمال بٹ نے فوٹو کو فریم میں لگا کر کچن میں آویزاں کیا۔ گھر میں یہی ایک فوٹو تھا جس میں اس کے مرحوم باپ کی تصویر تھی۔

عمر گزرنے کے ساتھ جمال بٹ کو فوٹو کے کرداروں سے متعلق زیادہ علم ہوا تھا۔ وہ اب ایک بیٹے اور بیٹی کا باپ بنا تھا۔

اپنے بیٹے کے تجسس کو دیکھ کر، جو پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، جمال بٹ فوٹو میں موجود مختلف افراد سے متعلق بتانے لگا۔

''یہ چھوانگ اور یوسف ہیں۔ چھٹی میں یہ میرے ہم جماعت تھے۔ آج کل یہ پٹواری ہیں۔''

جمعہ، ثناء اللہ اور ربکیس استاد لگے ہیں۔

چھرنگ صنم بودھی نویس تعینات ہوا۔

یہ ٹشی ہے۔ اس نے بھی آٹھویں جماعت پاس کی اور واصل باقی نویس تعینات ہوا۔"

"واصل باقی نویس کیا ہوتا ہے؟" اکبر نے سوال کیا۔

"یہ سرکاری خزانہ میں کام کرتا ہے۔ وہاں اکاؤنٹس وغیرہ دیکھتا ہے۔"

کچھ توقف کے بعد جمال بٹ بولا۔ "تمہارے دادا کے فوت ہونے کے بعد میں تعلیم جاری نہیں رکھ سکا، ورنہ میں بھی آج استاد یا پٹواری ہوتا۔"

"میری طرح ان بدنصیب لڑکوں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔" جمال بٹ نے فوٹو کی چند تصاویر پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"خاک کرتے ہیں۔ حسن نسوار بیچتا ہے۔ جب گرمیوں میں چینی ترکستان سے تجارتی قافلے لیہ پہنچتے ہیں، تب اس کا کام اچھا چلتا ہے۔ ہمارے کچھ پرانے ساتھی گرمیوں میں انگریز سیاحوں کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ قلی، خانساماں اور باربردار وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ کسی کسی سال برائے نام انگریز آتے ہیں۔

میرا دوست بیچارہ نوانگ لگان اور بیگار سے تنگ آ کر اپنی چھوٹی زمین چھوڑ کر ہماچل پردیش چلا گیا اور کبھی نہیں لوٹا۔ غلام نبی ایک تاجر کے ہمراہ پنجاب چلا گیا۔ شروع شروع میں ہم نے سنا کہ وہ پنڈی میں ہے۔ ایک دن خبر آئی کہ وہ کلکتہ چلا گیا ہے۔ تب سے کچھ پتا نہیں چلا۔

غفور اور ایشے لیہ کی سرکاری کوٹھی میں ترازو بردار لگے ہیں۔ تعلیم ادھوری چھوڑنے والوں میں ہم میں اکیلا غلام علی خوش قسمت نکلا۔ وہ برٹش جوائنٹ کمشنر کا اردلی ہے۔ یہ انگریز افسر گرمیوں میں چینی ترکستان کی تجارت کے کام دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ کہنے کو تو غلام علی اردلی یا جمعدار ہے لیکن بڑی آن بان والی ملازمت ہے۔ زریں جھالروں والی سرخ بانات کی وردی اور رنگین پگڑی میں وہ کتنا شاندار لگتا ہے۔ کمر سے پٹکا باندھتا ہے جس پر انگریز بادشاہ کی

تصویر ہے۔اس سال جب گرمیوں میں برٹش جوائنٹ کمشنر لیہ آئے گا تو تم غلام علی اور دوسرے اردلیوں کو دیکھ لو گے۔ اس گورے افسر کی سفارش پر اس کا بیگار معاف ہوا اور لیہ میں بڑی زمین الاٹ ہوئی۔آج اس کے بچے عیش کر رہے ہیں۔ وہ تو گوبند لال شاہ کا بھلا ہو، باپ کے فوت ہونے کے بعد انہوں نے مجھے ان کی جگہ اسکول میں چپراسی تعینات کیا۔''

''اس فوٹو میں کئی اچھے گھرانوں کے لڑکے بھی ہیں۔'' جمال نے اکبر کو فوٹو دکھاتے ہوئے کہا۔'' یہ خواجہ نصر شاہ کے بیٹے خان بہادر خواجہ غلام رسول اور ان کے بھائی خواجہ صدیق شاہ اور ان کی بہن کی اولاد ہیں۔اس خاندان کے کئی بیٹے کشمیر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ایلی ایزر جولدن ہیں۔ ان دنوں یہاں پڑھتے تھے۔ لاہور سے بی اے بی ٹی کر کے یہاں آئے ہیں۔آج اسی اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہیں اور تاریخ پڑھاتے ہیں۔ یہ لیہ میں تحصیل دار بن سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک استاد بننا پسند کیا۔ان کے باپ اقسقال ہیں۔''

''اقسقال؟'' اکبر مجسم سوال بن گیا۔

''اقسقال برٹش جوائنٹ کمشنر کا دایاں ہاتھ ہے۔''

''اس فوٹو میں ایک بھی لڑکی نہیں۔'' اکبر بولا۔

''ہاں ان دنوں کوئی اپنی لڑکی کو تعلیم نہیں دیتا تھا۔لڑکے بھی باقاعدگی سے اسکول نہیں آتے تھے۔گرمیوں میں بہت سارے لڑکے بھیڑ بکریاں چرانے جاتے تھے۔آج بھی تو اکا دکا لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔

اکبر، یہ جو بچے دیکھ رہے ہو، کالی کھانسی اور خسرہ سے مر گئے۔ ٹائفس نے کئی لڑکوں کی جانیں لیں۔ بے چارہ صنم دورجے خاکروب تپ دق سے مر گیا۔'' جمال نے چند تصویروں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔'' ان دنوں علاج معالجہ کی سہولت نہیں تھی۔''

باپ کی زندگی میں اکبر بٹ نے آٹھویں جماعت پاس کی اور چند ماہ بعد پٹواری مقرر ہوا۔انہی دنوں اسکول کو نویں جماعت کا درجہ دیا گیا۔

جمال بٹ جب خدا کو پیارا ہوا تو فوٹو کے ۹۱ کرداروں میں ۴۵ راہی ملک عدم ہوئے تھے۔ جمال بٹ نے اپنے والد کی طرح زیادہ زندگی نہیں دیکھی۔

ایک روز تاریخ کے استاد ایلی ایزر جولدن نے اس گروپ فوٹو کو ایک فوٹو گرافر کی دکان کے شیشے کے شیلف کے پیچھے آویزاں دیکھا۔ تاریخ کے استاد جذباتی ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے اکبر بٹ نے نیا فریم بنانے کے لیے دیا تھا۔

تاریخ کے استاد نے، جو اب لیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، اپنے پرانے شاگرد اکبر سے کہا۔ ''اکبر اس فوٹو نے میری بہت ساری بھولی بسری یادیں تازہ کی ہیں جو مجھے بڑی عزیز ہیں۔ ایک روز کے لیے یہ فوٹو مجھے مستعار دو۔ میں بچوں کو اس فوٹو کے آئینے میں وہ گزرا ہوا زمانہ دکھانا چاہتا ہوں۔''

صبح کی دعائیہ مجلس میں فوٹو دکھاتے ہوئے تاریخ کے استاد طلبا سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''ہر فوٹو کی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ خاص کر ایک پرانا فوٹو بہت کچھ بتاتا ہے۔ یہ فوٹو ۱۹۳۰ء میں لیا گیا تھا۔ جب میں بھی اس اسکول کا ایک طالب علم تھا اور پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

ہندوستان میں چلی جارہی تحریک آزادی میں ایک نیا موڑ آیا تھا۔ ایک سال پہلے ۱۹۲۹ء میں لاہور میں دریائے راوی کے کنارے کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا، جس کے ایک سال بعد سول نافرمانی کی تحریک چلی تھی۔ تب کشمیر میں بھی آزادی کی ایک لہر سی دوڑی۔ ان دنوں لداخ میں لوگ لمبی نیند کے بعد جاگ رہے تھے۔ اس سال ایک امریکی خاتون سیاح ہیز ائیتا سینڈس اکیلی لیہ آئی۔ ان دنوں پنڈت نرنجن ناتھ لداخ کا منتظم اعلیٰ تھا اور وزیر کہلاتا تھا۔ وہ خاتون سیاح اپنے سفر نامہ میں لکھتی ہے: ''لیہ میں مَیں آزادی سے گھومی پھری۔ ہر لداخی مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ خاص کر عورتیں بہت ہنستی ہیں۔ غریبی اور لاعلمی کے باوجود ان کی زندگی اچھی تھی۔ اپنے چھ ہفتے کے قیام کے دوران کسی نے مجھ سے دست درازی نہیں کی... ایک روز میں نے لیہ کے پادری سے پوچھا کہ میں اپنا روپیہ کہاں رکھوں؟ پادری بولے۔ ''آپ چاہیں تو اسے ڈیوڑھی پر رکھیں۔ یہ لوگ کبھی نہیں چراتے۔''

وہ آگے لکھتی ہیں: ''لداخی اپنے گھروں کے دروازے پر تالا نہیں لگاتے۔ جرائم برائے نام ہیں۔ لوگ سیدھے سادے ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔''

ایک رات وہ بازار آئی۔ دس بجے کا وقت تھا۔ لیہ میں گھپ اندھیرا تھا اور سارا شہر سوچکا تھا۔

تین سال بعد ۱۹۳۴ء میں لداخ میں تعلیمی جاگرتی لانے کے لیے لداخ بڈھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ اس روز ہندی کے لیکھک راہل سنکرواتسائن بھی لیہ میں تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو ایک خط میں سوسائٹی کے قیام سے آگاہ کیا۔

تاریخ کے استاد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ ''تب سے دریائے سندھ میں بہت پانی بہا ہے اور لداخ بہت بدلا ہے۔'' فوٹو کو لہراتے ہوئے انہوں نے طالب علموں سے کہا: ''اس فوٹو میں ۹۰ سے زیادہ کردار ہیں۔ گوشت پوست کے جیتے جاگتے کردار۔ ہر کردار کو بتانے اور سنانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ ہر کردار کی زندگی ایک لمبی کہانی ہے۔ سچی اور حقیقی کہانی۔ اس کہانی میں ہم اس دور کی سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بہت سارے کردار اس وقت دنیا میں نہیں ہیں۔ تاہم ان کی سرگزشتیں اور آپ بیتیاں ان کی اولاد اور زندوں کو ورثہ میں ملی ہیں۔ بہرحال یہ فوٹو ایک فوٹو ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے۔ ایک انمول اور نادر کتاب ہے۔ ایک ایسی کتاب جس میں کئی کتابیں ہیں، جو لداخ کی گوناگوں تہذیبی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ثقافتی پہلو لیجیے۔ اس گروپ فوٹو میں صنم پنچگ کی تصویر اور اس کی زندگی ہماری ثقافت کا ایک گوشہ پیش کرتی ہے۔ وہ ایک داستان گو تھا اور دیومالائی شخصیت گیالم کیسر کی طویل داستان زبانی ازبر تھی۔ یہ داستان لداخ کے علاوہ چین، منگولیا، تبت اور بلتستان میں بڑا مقبول ہے۔ سفر اور حضر دونوں میں وہ یہ داستان سناتا تھا۔ ایک مرتبہ لہاسہ کے سفر میں اس نے یہ داستان لیہ سے ایک پڑاؤ آگے سے سنانی شروع کی تھی۔ چھ ماہ کے سفر کے بعد جب وہ لیہ واپس پہنچا تب بھی یہ داستان ختم نہیں ہوئی تھی۔ تب لیہ سے لہاسہ گھوڑے پر یا پیدل تین ماہ کا سفر تھا۔ داستان سرائی اس زمانے کے لداخ کی عکاسی کرتی ہے، جب لوگوں کو فراغت تھی اور داستانیں سننا سنانا محبوب مشغلہ تھا۔

فوٹو میں صنم شکاری بھی ہے جو اس دور کی یاد دلاتا ہے جب لداخ 'شکاریوں کی جنت' کہلاتا تھا اور ہر سال یورپی شکاری شکار کھیلنے لداخ آتے تھے۔ یہ جنگلی جانوروں کے سر وغیرہ

بطور ٹرافی لے جاتے تھے۔ صنم ایک منجھا ہوا شکاری تھا اور یورپی دوسرے مقامی شکاریوں پر صنم کو ترجیح دیتے تھے۔

یہاں ایک غلام محمد ہے۔ وہ ضیافتوں اور دعوتوں پر بطور دربان طفیلیوں کو روکتا تھا۔''

''طفیلی کس کو کہتے ہیں؟'' ایک ساتھ دو تین لڑکوں نے سوال کیا۔

''جو بن بلائے دعوتوں میں جا کر کھانا کھائے، اس کو طفیلی کہا جاتا ہے۔'' تاریخ کے استاد بولے۔'' ان دنوں بہت طفیلی ہوتے تھے۔ آج لوگوں کو دعوتوں پر جانے کی فرصت نہیں ہے۔''

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے تاریخ کے استاد بولے۔'' اس گروپ فوٹو میں ایسے بہت سارے طالب علم ہیں جو غریبی کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے۔''

کچھ وقفہ کے بعد تاریخ کے استاد نے کہا۔'' ہم ایک کردار کے آئینے میں اس سے وابستہ لوگوں کے ماضی کو دیکھ سکتے ہیں اور مستقبل میں تاک جھانک کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم یہاں ایک کردار عبدالقادر کو لے لیتے ہیں۔ وہ اسکول کا چوکیدار تھا۔ اس کا والد عبدالغفور بڑا غریب تھا۔ ۱۹۰۷ء میں سویڈن کا معروف مہم جو محقق سیون ہیڈین سنٹرل ایشیا جانے کے لیے لیہ آیا۔ ہیڈین کو اپنی مہم کے لیے قلیوں اور ٹٹو والوں کی ضرورت تھی۔ لیہ میں تب بڑی بے روزگاری تھی۔ انتہائی مشکل کام کے باوجود جسمانی محنت مشقت کرنے کے قابل لیہ کے اکثر لوگ ہیڈین کے پاس پہنچے۔ کسی کے پاس سفارشی خط تھا۔ کوئی کسی یورپی سیاح کی دی ہوئی سند لایا تھا۔ ہیڈین کو صرف پچیس آدمیوں کی ضرورت تھی۔ ۶۲ سالہ عبدالغفور نے ہیڈین سے کہا۔ 'صاحب! آپ اگر مجھے اس مہم میں اپنے ساتھ نہ لیں گے تو سردیوں میں میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔'

کارواں لیڈر محمد عیسیٰ نے عبدالغفور کو کارواں میں شامل کرنے کی سفارش کی کیونکہ وہ اس سے پہلے ایسی مہمات میں بطور قلی اور باربردار کام کر چکا تھا۔

غفور نے اپنے ساتھ سفر میں ایک کفن لیا تاکہ اس کی موت کی صورت میں بروئے کار لایا جا سکے۔ باون سالہ کارواں لیڈر محمد عیسیٰ کفن دیکھ کر قہقہہ زن ہوا۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ عبدالغفور صحیح وسلامت لیہ پہنچا اور محمد عیسیٰ اس سفر کے دوران تبت کے ایک دور افتادہ مقام پر چل بسا

اس شام بہت سارے گھروں میں فوٹو کا تذکرہ ہوا۔ گھروں سے نکل کر یہ بات چھوٹے سے قصبے کے بازار میں پہنچی اور فوٹو کا خوب چرچا ہوا۔ اس روز کئی آدمی اکبر کے گھر فوٹو دیکھنے آئے۔

''فوٹو صاف نہیں نکلا ہے۔'' اکبر کا بیٹا مسعود بولا۔ ''ابا یہ کس نے کھینچا ہے؟''

''منشی غلام محی الدین نے یہ فوٹو کھینچا۔''

''دھندلا دھندلا ہے۔ گھٹیا سا کیمرہ ہوگا۔'' مسعود بولا۔

''بیٹا! ان دنوں منشی غلام محی الدین واحد فوٹو گرافر تھے۔ وہ اسکول اور دوسری تقریبات میں گروپ فوٹو لیا کرتے تھے۔ تین پائے والی لکڑی کی ایک چوکی پر کیمرہ رکھ کر ایک سیاہ کپڑا سر پر اوڑھے کیمرے کی آنکھ سے پہلے ہمیں دیکھتے تھے۔ پھر سیاہ کپڑے میں سے سر نکال کر سب پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے تھے۔ ٹھیک سے پوز لینے کی ہدایت دیتے اور ان کا سر سیاہ کپڑے میں ڈوب جاتا۔ پھر سر اچانک نمودار ہوتا اور فلاں فلاں لڑکے کو مزید ہدایت دے کر دوبارہ سیاہ کپڑے میں روپوش ہو جاتے اور اندر سے ریڈی کی آواز آتی۔ لیکن کبھی کبھی ریڈی کی آواز کے بعد بھی سر باہر نکال کر کسی لڑکے کو ایک عدد ڈانٹ پلا کر سر دوبارہ سیاہ کپڑے میں غائب ہو جاتا۔ گاہے گاہے فوٹو بالکل خراب نکلتا تھا۔ پھر بھی یہ مقام شکر ہے کہ ان دنوں منشی غلام محی الدین تھے، جن کی بدولت اس زمانے کی بہت ساری یادگاری تصویریں آج بھی کئی بزرگوں یا ان کی اولاد کے پاس محفوظ ہیں۔''

اکبر بٹ نے اپنے بیٹے کا نام مسعود احمد رکھا اور نام کے ساتھ بٹ کی ذات لکھنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شاید وہ خود بھی نام کے ساتھ بٹ کا لفظ پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آبا و اجداد کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں لداخی راجہ پنچگ نمگیل کے زمانے میں ان کے خاندان کا پہلا فرد تجارت کے سلسلے میں لداخ آیا تھا۔ ایک لداخی عورت سے شادی کی اور مستقل طور پر لیہ میں بس گیا۔

اکبر بٹ گرداور ریٹائر ہوا۔ اکبر نے مسعود اور بیٹی تہمینہ کو اچھی تعلیم دی۔ مسعود انجینئر بنا اور تہمینہ نے بی ایڈ کیا۔ پھر بڑی دھوم دھام سے مسعود کی شادی کی۔ ان دنوں ایک پٹواری اور

گرداور کی اچھی خاصی بالائی آمدنی تھی۔

ایک سال بعد گھر میں ایک نیا مہمان آیا۔ تب فوٹو کے چند ہی کردار حیات تھے۔ البتہ گروپ فوٹو کے زندہ اور فوت شدہ افراد کی اکثر اولاد خوش حال زندگی بسر کر رہی تھی۔ کئیوں کے پاس گیسٹ ہاؤس اور ہوٹل تھے۔ کئی ریستوران چلا رہے تھے۔ کچھ ٹھیکے دار تھے۔ بہتوں کے پاس ٹرک اور ٹیپر تھے۔ ان کے بیٹے، پوتے پوتیاں وغیرہ لداخ اور لداخ سے باہر اچھے اسکولوں، کالجوں وغیرہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

مسعود نے بیٹے کا نام عدنان رکھا۔ دو سال بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام عرفان رکھا۔ تب اکبر بٹ اس دنیا میں نہیں رہے۔

ایک روز عدنان پرانا البم الٹ پلٹ رہا تھا۔ وہ پانچ سال کا ہوا تھا۔ ''پاپا! آپ نے اس میں ایک گندہ فوتو لکھا (رکھا) ہے۔'' عدنان توتلی زبان میں بولا۔

''بھئی! اس فوٹو میں تو ہمارے پردادا اور دادا ہیں۔''

مسعود کو اپنے پردادا اور دادا کی تصویریں پہچاننے میں دقت ہوئی۔ باپ نے دو دفعہ اس کو یہ تصویریں دکھائی تھیں لیکن پچھلے چار سال کے دوران فوٹو اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا اور وہ انہیں بھول چکا تھا۔

''پاپا! پل دادا اور دادا کہاں ہیں؟'' عدنان نے پوچھا۔

''یہ پردادا ہو سکتا ہے اور یہ ٹھہرا تمہارا دادا۔'' مسعود نے اپنی انگلی سے دونوں تصویریں دکھائیں۔ لیکن اپنے کہے پر اس کو اعتماد نہیں تھا۔

''کون انہیں شناخت کر سکتا ہے؟'' وہ سوچنے لگا۔ اس زمانے کے تقریباً سارے بزرگ اب نہیں رہے ہیں۔

عدنان، عرفان کو فوٹو دکھانے لگا جو البم سے نکل کر اب دونوں بچوں کے کھلونوں میں شامل ہوا تھا۔ اسی اثنا میں مسعود کو اچانک تاریخ کا استاد یاد آیا۔ اس نے سوچا، وہی اس کے دادا اور پردادا کی تصویریں پہچان سکتے ہیں۔ وہ ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔

مسعود فوٹو لے کر تاریخ کے استاد سے ملا جو اب ریٹائر ہو چکے تھے۔

''سر، ان میں میرے دادا اور پردادا کون ہیں۔ میں انہیں پہچاننے میں کنفیوژ ہو رہا ہوں۔'' اس نے فوٹو ان کے سامنے رکھتے ہوئے سوال کیا۔

تاریخ کے استاد نے فوٹو پر ایک نظر ڈالی اور مسعود سے کہا۔

''پہلے تم بتاؤ مسعود، تمہارے خیال میں تمہارے دادا اور پردادا ان میں کون ہو سکتے ہیں؟''

مسعود نے ایک طرف کھڑے رومی ٹوپی پہنے ادھیڑ عمر کی تصویر پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''سر، میرے خیال میں یہی میرے پردادا ہیں۔''

''تم نے ٹھیک پہچانا۔ یہی تمہارے پردادا اسلام بٹ ہیں۔ اور دادا کون ہیں؟''

مسعود نے اگلی قطار میں بیٹھے ایک بچے کی تصویر دکھائی۔

''نہیں بھئی، یہ حبیب اللہ ہے۔ جو بُولا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تمہارا دادا جمال بٹ یہ ہے۔'' تاریخ کے استاد نے ایک اور بچے کی تصویر دکھائی جو حبیب اللہ سے آگے کی قطار میں ایک اور بچے کی بغل میں دوزانو بیٹھا تھا۔ دوبارہ انہیں نہیں بھولنا مسعود!'' وہ مسعود سے بولے۔

حبیب اللہ کی تصویر پرانے استاد کو ایک دفعہ پھر ماضی کی پہنائیوں میں لے گئی۔ وہ پہلے کی طرح چہکنے لگے۔ پیرانہ سالی کے باوجود تعلیم اور تاریخ سے ان کی دلچسپی میں کمی نہیں آئی تھی۔

''حبیب اللہ نے اپنی زندگی میں یورپیوں کے ساتھ بطور قلی، ٹٹو والا، خانساماں، مترجم اور آخر کار کارواں لیڈر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔''

وہ بولے اور حسب معمول ایک واقعہ سے دوسرے دلچسپ واقعات جوڑنے لگے۔

''ہندوستان آزاد ہونے سے ایک روز پہلے ایک امریکی نکل اسمتھ اور اس کا ایک ساتھی لیہ پہنچا۔ حبیب اللہ نے جو سرینگر سے ان کے ساتھ تھا، مجھے بتایا۔ دراس سے آگے انہوں نے دیکھا کہ ایک بیمار لڑکے کو چار آدمی ایک چارپائی پر ایک کھردرے کمبل میں لپیٹے علاج کے لیے سرینگر لے جا رہے تھے۔ یہ لوگ کئی روز سے سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے امریکیوں سے

دوائی مانگی۔ ان دنوں زندگی بڑی سخت تھی مسعود! علاج معالجہ اور حفظانِ صحت کی سہولیات برائے نام تھیں۔''

کرگل کے بازار میں جب اسمتھ اور اس کے ساتھی کو لوگوں نے سلام کیا تو اسمتھ نے اپنا ردعمل ان الفاظ میں بتایا:

''نیویارک کے ففتھ ایونیو میں مجھے آج تک کسی نے سلام نہیں کیا۔''

تاریخ کے استاد بولے۔''لداخی جہاں بڑے حلیم تھے، وہاں احساس کمتری کے شکار بھی تھے۔''

لیہ میں موراوین مشن کے پادری والٹر اسبو نے اسمتھ کو بتایا کہ لیہ میں بیس سال کے قیام کے دوران انہوں نے کسی لداخی کو کتے کو مارتے نہیں دیکھا۔ اسبو کے خیال میں یہ بدھ مت کی تعلیم کا اثر تھا۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے استاد بولے:''ایک روز پہلے ہندوستان آزاد ہوا تھا لیکن یوم آزادی پر لیہ میں کوئی تقریب نہیں ہوئی۔ کوئی نعرہ بلند نہیں ہوا۔ کوئی پرچم نہیں لہرایا گیا۔ کیوں دورجے! آپ کو یاد ہے؟'' تاریخ کے استاد نے اپنے پاس بیٹھے ایک بزرگ سے پوچھا۔

''جی ہاں پوری طرح یاد ہے۔ کوئی جلسہ جلوس نہیں ہوا۔'' دورجے نے جواب دیا۔

''ملک کا بٹوارہ ہوا تھا۔ کشمیر کی طرح لداخ میں بھی غیر یقینی صورت حال تھی۔ عجب دھواں دھواں سی کیفیت تھی۔''

تاریخ کے استاد کی بوڑھی آنکھیں خلا کو گھورنے لگیں۔

کچھ دنوں بعد فوٹو پھر ایک دفعہ بچوں کے ہاتھ پڑا اور ان کے کھلونوں کا حصہ بنا۔ ایک روز عدنان نے اس میں ایک دھاگا پروکر اپنے بچپنے کے تخیل ہی تخیل میں اسے گاڑی بنا کر چلایا۔

مسعود نے عدنان کو ڈانٹ پلائی اور فوٹو نے دوبارہ البم میں جگہ پائی۔

دو سال بعد مسعود احمد کا خاندان اپنے آبائی مکان سے نئے عالی شان مکان میں منتقل

ہوا۔ آبائی مکان قصبے کے ایک گنجان محلے میں تھا۔ اس کے ساتھ پرانا فوٹو بھی وہاں پہنچ گیا۔

ایک روز مسعود کی بیوی نے جب یہ پرانا فوٹو ڈرائنگ روم میں پھینکا ہوا پایا تو منہ بسور لیا۔ دل ہی دل میں اس نے سوچا کہ یہ فوٹو نہ تو البم میں جچتا ہے اور نہ گھر میں پھبتا ہے۔ اس کی اصلی جگہ تو کوڑے دان ہے اور اسے اس کی اصلی جگہ پہنچا دیا۔ اس کے بعد کسی نے وہ فوٹو دوبارہ نہیں دیکھا اور نہ اس سے متعلق دریافت کیا۔

یہ اتفاق تھا کہ جس روز یہ فوٹو کوڑے دان میں پھینکا گیا، اسی روز تاریخ کے استاد ایلی ایز رجولدن نے آخری سانس لی۔ تب وہ چھیاسی سال کے تھے۔

یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ وہ گروپ فوٹو کے آخری فرد تھے!

(آج کل، نئی دہلی)



جھنڈا والا

اخبار والا لڑکا صبح دو اخبار چھوڑ کر چلا گیا۔ سجاد اور سلطان نے ایک ایک اخبار اٹھایا اور اپنے پسندیدہ کالم دیکھنے لگے۔ مالک مکان کی بیٹی فلمی خبروں والا صفحہ نکال کر لے گئی۔

ہم چار اس مکان میں Paying Guest تھے۔ سجاد نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اسد ایک پرائیویٹ دفتر میں کام کرتا تھا۔ سلطان جو محلے میں انکل باؤلر کے نام سے جانا جاتا تھا، روزگار کی تلاش میں شہر آیا تھا۔ میں گریجویشن کے بعد سول سروس امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ہم چاروں دیہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

چار ماہ پہلے جب میں یہاں آیا، تب محلے کی گلی میں سلطان چند بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں یہاں ٹھہرنے کے لیے آیا ہوں تو گیند اور بلا چھوڑ کر میرے پاس آیا اور سوالات کی بوچھار کی۔ باپ کیا کام کرتا ہے؟ کتنی تنخواہ پاتا ہے؟ کس گاؤں سے آیا ہے؟ کب تک رہنا ہے؟ ماں گرہستن ہیں یا ملازمہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران چھ سات سالہ ایک بچہ اپنا بلا لے کر سلطان کے پاس آیا اور لجاجت سے بولا۔ ''انکل، مجھے بال پھینکو نا۔''

''عبید!'' سلطان نے پکارا۔ اور ایک لڑکا دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ''اس کو بال پھینکو!'' سلطان نے حکم دیا اور بچے سے مخاطب ہو کر کہا۔ 'جاؤ، عبید بال پھینکے گا!''

میں نے آتے میں اخبار والے لڑکے کو کہا کہ وہ مجھے ٹائمز آف انڈیا اور ایک مقامی اخبار چھوڑا کرے۔ اخبار بینی مجھے اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اپنے امتحان کے سلسلے میں

انہوں نے مجھے بلا ناغہ اخبار پڑھنے کی ہدایت بھی دی تھی۔

ہمارے کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا آنگن تھا جس پر دو بوسیدہ بنچیں لگی تھیں۔ صبح یہاں دھوپ پڑتی تھی اس لیے ہم یہیں بیٹھا کرتے تھے۔

سجاد کھیل کود کے کالم پڑھتا تھا اور آٹھ دس منٹ میں ختم کرتا تھا۔ سلطان صرف اشتہارات پڑھتا تھا اور سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں لیتا تھا۔ دو مرتبہ اس نے مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کیں۔ مجھے باپ نے گھاس کاٹنے کی ایک مشین لانے کے لیے کہا تھا۔ مارکیٹ میں یہ مجھے نہیں ملی اور ایک روز باتوں باتوں میں سلطان سے اس کا ذکر کیا۔ سلطان نے مجھے اشتہار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو... گھاس کاٹنے کی مشین کا اشتہار۔ شاید آپ کے کام کا ہے!''

اسی برانڈ کی مشین مجھے درکار تھی۔ ایڈ پر کمپنی کا نام اور فون نمبر دیا تھا۔ دوسری مرتبہ اس نے ایک مقبول اسکول میں نرسری سطح کے بچوں کے داخلہ کے سلسلے میں انٹرویو کی تاریخ سے آگاہ کیا۔ مجھے اپنی بھانجی کا داخلہ لینا تھا۔ میں دو مرتبہ اس اسکول میں تاریخ پتہ کرنے گیا تھا اور متعلقہ کلرک نے اخبار دیکھنے کے لیے کہا تھا۔

مالک مکان کی بیٹی کو صرف فلمی خبروں اور فیچروں سے دلچسپی تھی۔ اس کے ذوق کو دیکھ کر میں کبھی کبھی اسٹارڈسٹ یا فلم فیئر خرید کر لاتا تھا۔

ہمارے ایک اور ساتھی اسد کو اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ ہمیں اخبار پڑھتے دیکھ کر وہ اکثر کہتا تھا۔ ''کوئی خاص خبر!'' جواب سننے سے پہلے وہ اکثر اپنی راہ لیتا تھا۔

میں ہی اکیلا خبریں، اداریے اور اخبار میں چھپنے والے مضامین پڑھتا تھا۔

ہم میں زیادہ پڑھے لکھے مالک مکان تھے۔ وہ ہفتہ عشرہ کے بعد گھر آتے تھے اور ایک یا دو دن گزار کر چلے جاتے تھے۔ وہ ایک کالج میں استاد تھے۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے اخبار لیا اور اس پر نظر ڈال کر ڈیڑھ دو منٹ کے بعد واپس کرتے ہوئے بولے۔ ''جرائم کے ارتکاب میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نمائندگی اچھی خاصی ہے۔ پچیس تیس فیصد سے کم نہیں ہوگی۔ چاہے قتل ہو، ڈکیتی ہو، ریپ ہو یا چھل کپٹ اور دھوکا دہی ہو۔''

بکس میں ایک چھوٹی سی خبر تھی۔ پولیس نے کرایہ کے تین قاتلوں کو پکڑا تھا ان میں ایک مسلمان نام بھی تھا۔

''ایسے معاملوں میں مسلمانوں کی غیر مسلموں سے اچھی ملی بھگت رہتی ہے۔ البتہ تعلیم خاص کر ملازمت میں مسلمانوں کی شرح نمائندگی تین چار فیصد سے زیادہ نہیں جاتی ہے۔''

وہ مجھے بڑے دلچسپ آدمی لگے۔

ایک روز میں کوچنگ سینٹر سے لوٹا۔ سلطان گلی میں ایک دکان کے پٹرے پر بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا بچوں کے لیے ایک پتنگ بنا رہا تھا۔ سامنے قینچی اور لیئی رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کام چھوڑ کر میرے ساتھ آنگن میں آیا اور مجھ سے پوچھا۔

''ٹرانسپورٹ کے وزیر کو تو نہیں جانتے ہو؟''

''میں اس کے سایہ کو بھی نہیں جانتا ہوں۔''

یہی سوال اس نے سجاد سے کیا۔ سجاد بولا۔ ''منسٹروں تک ہماری پہنچ کہاں ہے انکل؟''

''بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک پوسٹ نکلی ہے۔''

''کیسے پتہ چلا؟'' سجاد نے سوال کیا۔

''اخبار میں تھا۔ میں ٹرانسپورٹ کے دفتر گیا۔ وہاں تصدیق ہوئی۔''

''کچھ پیسہ خرچنا تھا۔'' سجاد بولا۔

''وہ تو میں تیار ہوں۔'' سلطان بولا۔ ''بابو کہتا ہے۔ ٹرانسپورٹ یا کسی منسٹر سے ایک سفارشی خط لاؤ۔ وہ کام کرا دے گا۔''

کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''کام مشکل نہیں ہے۔ یارڈ میں بیٹھنا ہے اور مہینے کے آخر میں تنخواہ لینی ہے۔ آپ دونوں کی طرح میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ یہ کام ملے تو میرے لیے غنیمت ہے۔''

وہ دن کو غائب رہنے لگا اور شام کو آ کر ہم کو بتاتا تھا کہ کوئی کام نہیں بنا۔ کئی روز گزر گئے۔ مجھے اچانک جھنڈا والا یاد آیا۔ میں نے سلطان سے کہا۔ ''میں ایک آدمی کو جانتا ہوں،

جو حکمران ٹولے کے جلسے جلوسوں میں جھنڈا لے کر ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے اور جھنڈا والا کہلاتا ہے۔ اگر اس سے یہ کام ہو سکے تو میں آپ سے ملاؤں گا۔''

میں نے جھنڈا والا سے سلطان کی ملاقات کرائی۔ سلطان نے اشتہار کے تراشے کی فوٹو کاپی بنا کر جھنڈا والے کو دیا۔

چار روز بعد سلطان خوش خوش ہمارے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں پیڈ پر لکھا ہوا وزیر کا سفارشی خط تھا۔ اس نے لفافے میں سے خط نکال کر بڑے فخر سے ہم کو دکھایا پھر وہ مالک مکان کی سائیکل پر خط حوالے کرنے ٹرانسپورٹ دفتر گیا۔

بابو نے اس کو ایک ہفتہ بعد آنے کے لیے کہا تھا۔ سلطان بولا۔

''میں تم دونوں سے عمر میں آٹھ دس سال بڑا ہوں۔ عمر زیادہ ہو جائے تو مجھے کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔''

دوسرے روز وہ گاؤں چلا گیا۔ چار روز بعد جب لوٹا تو ہمارے لیے سیب کی ایک پیٹی لایا تھا۔ اس نے پہلے بھی ہمیں سیب لایا تھا۔ وہ اکثر گاؤں میں اپنے سیب کے باغ کا ذکر کرتا تھا۔

دوسری صبح وہ حسب معمول اخبارات کے اشتہارات پڑھنے لگا۔

سجاد بولا۔ ''اب ملازمت پکی ہوئی ہے۔ اشتہارات پڑھنا چھوڑ دو۔''

''اشتہارات پڑھنے میں اپنا مزہ ہے۔'' سلطان بولا۔

میری نظر ایک خبر پر پڑی۔ کائنات میں ایک ایسا سیارہ دریافت ہوا تھا جو خالص الماس کا بنا ہوا تھا۔ میں نے خبر پڑھ کر سنائی۔

''الماس کیا ہوتا ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''Diamond کو کہتے ہیں۔ ہیرا سمجھ لو۔''

''چاچی!'' سلطان مالکن کی طرف دیکھ کر چلایا، جو آنگن میں الگنی پر کپڑے سکھانے کے لیے ٹانگ رہی تھی۔ ''ایک خوش خبر سنو۔''

مالکن نے سلطان کی طرف دیکھا۔

''آسمان پر ایک ستارے کا پتہ چلا ہے جو خالص ہیرے کا بنا ہوا ہے۔''

''جب جاؤ گے تو میرے لیے بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے آنا۔'' وہ خاتون بولی۔

''چھوٹا کیوں، میں بڑا سا لے آؤں گا۔''

''انکل باؤلر کیا بول رہا ہے؟'' مالک مکان باہر آ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''سر یہ ڈائمنڈ والے سیارے کی بات کر رہا ہے۔'' سجاد بولا۔

انہوں نے سجاد کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ یہ خبر پڑھی۔ سر کو ہلکی سی جنبش دی اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ہمیں مخاطب ہوئے۔

''ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت اپنی جگہ۔ باپ اپنی نوعمر بیٹی کا منہ کالا کرتا ہے۔ پھر چچا اور بیٹا اس میں شامل ہوتے ہیں اور آبروریزی جاری رہتی ہے۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو کوڑے دان میں پھینکتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک چھ سالہ بچی کی عصمت دری کرتا ہے اور پھر گلا گھونٹ کر مارتا ہے۔ قدیم روما اور یونان میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ آج ہم آئے دن ایسی خبریں پڑھتے ہیں۔ عینیت پسند لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے مایوس نہ ہو۔ انسان سے مایوس کیوں نہ ہو؟''

''سر، کیا اخبار میں کوئی ایسی خبر دی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ پڑھو۔'' انہوں نے خبر دکھائی۔

ادھیڑ عمر کے ایک آدمی نے چھ سالہ بچی کے ساتھ منہ کالا کر کے اس معصوم کا گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

ہفتہ پورا ہونے پر سلطان ٹرانسپورٹ آفس چلا گیا۔ جب لوٹا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔

''بڑے پریشان لگتے ہو۔ خیریت تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''وزیر نے ٹرانسپورٹ کے اس پوسٹ کے لیے الگ الگ تین آدمیوں کے لیے حکم اجرا کیا ہے۔ تین اور سربمہر لفافے پڑے تھے۔ بابو بولا۔ ان میں بھی اسی پوسٹ کے لیے سفارش ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم نے ابھی ان کو نہیں کھولا ہے۔''

''پھر؟''

''میں نے ایک بابو سے پوچھا۔ میرا کوئی چانس ہے۔ وہ بولا۔ سفارش دو قسموں کی ہوتی

ہے۔ایک کچی اور ایک پکی۔ یہ ساری سفارشیں کچی ہیں۔ پکی سفارش کے لیے منسٹر افسر سے براہ راست بات کرتا ہے یا افسر کو بلا کر ذاتی طور پر ہدایت دیتا ہے۔اب میں کیا کروں؟'' سلطان نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' سجاد بولا۔

''جھنڈا والے سے دوبارہ ملو۔شاید وہ کوئی راستہ دکھائے۔'' میں نے رائے دی۔

دو روز بعد میں نے سنا، سلطان بوریا بستر اٹھا کر مکان سے چلا گیا۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔محلہ کے بچے روز آ کر ہمیں پوچھتے تھے کہ انکل باؤلر کب آئے گا؟

لگ بھگ دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ ہم سلطان کو بھول چکے تھے۔ میں کوچنگ سنٹر جا رہا تھا۔ایک جگہ سڑک پر ٹریفک جام تھا۔سنا، ایک طرف سے جلوس آ رہا ہے۔سڑک کے تھڑے پر تماشائی کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہوا۔جلوس ہمارے سامنے سے گزرنے لگا۔ انکل باؤلر علمبردار بنا تھا۔ پارٹی کا ایک بڑا جھنڈا اٹھا کر وہ آگے آگے چل رہا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہا تھا۔

(ماہنامہ وقار ادب)



راشن کارڈ

وہ متعدد آدمیوں کے درمیان اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں غل غپاڑے سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کافی انتظار اور جدوجہد کے بعد دھکم دھکا کھاتا اور لوگوں کے درمیان اپنا سر سماتا ہوا میں اس کے سامنے پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تن وتوش والا بندہ ہوگا لیکن وہ چھوٹا منحنی سا آدمی تھا۔ طوطے کی چونچ کی طرح خمدار ناک کے بانسے پر دھرے چشمے کے پیچھے اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں ایک فائل پر جمی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں ریکوں اور سامنے میز پر راشن کارڈ کے ڈھیر لگے تھے۔

''لال صاحب! لال صاحب! میرا کارڈ دیکھیے۔'' بھیڑ میں کئی آدمی ایک ساتھ بول رہے تھے۔

وہ مجھے ایک انوکھی مخلوق لگی جو پاس کھڑے لوگوں کے شور وغل سے مخل ہوئے بغیر اطمینان سے ایک فائل دیکھ رہا تھا۔

جب ایک جانی پہچانی آواز سنی تو اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ چشمے کی آڑ سے ایک نظر ڈالی اور میز کی دراز میں سے ایک راشن کارڈ نکال کر اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس آدمی کو دیا۔ پھر اس کی نگاہیں دوبارہ فائل پر جھک گئیں۔

''لال صاحب! لال صاحب!'' کی دوبارہ الاپ ہونے لگی لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ لیکن جب ایک مانوس آواز نے راشن کارڈ مانگا تو اس کی طرف دیکھے بغیر دراز میں رکھے راشن کارڈوں میں سے ایک راشن کارڈ نکال کر اپنے لبوں پر ایک تبسم بکھیرتا ہوا

اُسے حوالہ کیا اور دوبارہ فائل دیکھنے میں محو ہو گیا۔

اس کے جانب دارانہ رویہ پر جب ایک آدمی نے اعتراض کیا تو وہ رُکھائی سے بولا۔

''کیا میں یہاں مکھیاں مار رہا ہوں۔''

''جی نہیں۔ آپ کام کر رہے ہیں، لیکن ہم بڑی دیر سے یہاں کھڑے ہیں، ہمیں فارغ کیجیے۔'' ایک مسن صورت آدمی بولا۔

اس نے فائل بند کر کے ریک میں رکھا اور راشن کارڈ تقسیم کرنے لگا۔ دس بارہ کارڈ تقسیم کرنے کے بعد وہ ایک رجسٹر کی خانہ پُری کرنے لگا۔

لال صاحب! لال صاحب! کی آوازیں دوبارہ بلند ہوئیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ انوکھا ہی نہیں بلکہ ڈھیٹ بھی ہے۔

''لال صاحب!'' میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''براہ مہربانی میرا کارڈ دیکھیے۔'' لیکن وہ ایک بُت کی طرح ساکت و جامد رہا۔ تاہم پیچھے سے آئی ایک منحنی اور باریک سی آواز سے ان کا دھیان رجسٹر سے ہٹ گیا۔ آواز کی طرف ایک نظر ڈالی اور دراز میں سے ایک راشن کارڈ نکال کر چپکے سے ایک خاتون کے حوالہ کیا۔

وہ ایک دفعہ پھر رجسٹر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس کے اس طرزِ عمل سے میں بھنّا اٹھا اور میں نے قدرے اونچی آواز میں احتجاج کیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''کیا کسی بہرے سے مخاطب ہو؟''

''ہمارے لیے آپ بہرے ہیں لیکن اپنوں کے لیے بہرے نہیں ہو۔''

اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ''خاموش ہو گا یا نکلوا دوں؟''

میرا پارہ یک لخت چڑھ گیا۔ ''ذرا نکال کر تو دکھاؤ!'' میں للکارا۔

''بک بک بند کرو گے یا؟'' وہ رجسٹر بند کرتا ہوا بولا۔

''بک بک آپ کرتے ہو یا میں کر رہا ہوں؟''

''لڑنے آئے ہو یا راشن کارڈ لینے آئے ہو؟'' ایک آدمی نے مجھے ٹوکا۔

''لال جی! آپ جانے بھی دیجیے ہمارے کارڈ دیکھ لیجیے۔'' ایک ساتھ دو تین آدمی

بولے۔

عجیب نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔

''جو پہلے آئے ہیں، ان کو پہلے کارڈ ملنے چاہئیں۔ یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ میں ڈائرکٹر صاحب سے شکایت کروں گا۔'' میں آپے سے باہر ہوا۔

''ابے جا جا۔ ڈائرکٹر کے پاس کیوں جاتے ہو؟ فوڈ اینڈ سپلائز منسٹر کے پاس بھی جاؤ اور شکایت کرو۔'' وہ اپنا بازو لہرا کر مجھے چڑاتے ہوئے بولا۔

''بھئی، تم شکایت کرنے جاؤ اور ہمارے لیے جگہ چھوڑو۔'' میرے پیچھے کھڑا آدمی ہلکا سا ٹھوکا دیتے ہوئے مجھے بولا۔

میں نے غصے کا گھونٹ پی لیا اور بادلِ ناخواستہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

''آیا ڈائرکٹر کا سالا!'' پیچھے سے آواز آئی اور قہقہہ بلند ہوا۔ میں غصے سے آگ بگولا ہو کر سراپا شکایت بنے کوریڈور میں پہنچا اور خیال ہی خیال میں اس منحنی اور مختصر وجود کو الف ننگا کر کے ایک پیڑ سے بندھوایا اور کوڑے لگوائے۔ اس کی ننگی پیٹھ پر نیلی نیلی لکیریں ابھرنے لگیں۔ وہ چیخنے چلانے لگا لیکن میرا دل نہیں بھرا اور اس کو ایک فائرنگ سکاڈ کے سامنے کھڑا کیا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ اس کا چہرہ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ تب مجھے اس پر ترس آیا اور میرے بھکے بھکے خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایسے میں مَیں نے اپنے آپ کو ڈائرکٹر فوڈ کے کمرے کے سامنے پایا۔

ڈائرکٹر کے چیمبر کے دروازے کے پاس ملنے والوں کی بھیڑ سی لگی تھی۔ چپراسی ان سے کہہ رہا تھا کہ اندر میٹنگ چل رہی ہے اور صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو اندر آنے نہ دیں۔ مجھے یک گونہ اطمینان ہوا کہ مسئلہ صرف مجھے ہی نہیں ہے، بہتوں کو ہے۔

ایک خوش پوش آدمی نے چپراسی کو اپنا کارڈ دیا۔ جسے وہ اندر پہنچا کر باہر آیا۔ چند لمحوں کے بعد گھنٹی بجی۔ چپراسی دوبارہ اندر گیا۔ خوش پوش آدمی کو صاحب نے بلایا تھا۔

''میٹنگ کب ختم ہوگی؟'' کسی نے سوال کیا۔

''مجھے کیا پتہ ہے، کب ختم ہوگی؟'' چپراسی رکھائی سے بولا۔ کچھ آدمی مایوس ہو کر

چلے گئے۔

ایک آدمی کو دور سے آتے دیکھ کر چپراسی ادب سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی چلمن اٹھائی۔ وہ اندر چلا گیا۔

''کون تھا؟'' ایک مریل سے آدمی نے چپراسی سے پوچھا۔

''اپنے کام سے کام رکھو۔'' یہ چپراسی کا جواب تھا۔

''آپ لوگ ڈپٹی ڈائرکٹر سے کیوں نہیں ملتے۔ یہاں کب تک رہو گے؟'' چپراسی نے مشورہ دیا۔

ڈپٹی ڈائرکٹر کے کمرے کے باہر بھی بھیڑ تھی۔ وہاں میٹنگ والی بات تو نہیں تھی لیکن چپراسی آدمی کی وضع قطع اور لباس دیکھ کر چٹ لیتا تھا۔ گھنٹی بجنے پر وہ اندر جاتا تھا اور ملاقاتی کو بلاتا تھا۔ میں نے جب ایک چٹ پر اپنا نام لکھ کر اس کے حوالے کیا تو اس نے نخوت سے لینے سے انکار کیا۔

''کیا چٹ کے لیے ٹائی اور سوٹ بوٹ میں ہونا ضروری ہے؟'' میں نے احتجاج کیا۔

اس نے شاید خفت محسوس کی اور میری چٹ بھی اندر پہنچائی۔ راشن کلرک لال کی طرف داری اور بداخلاقی کے خلاف میرے ذہن میں چند جچے تلے الفاظ ڈھلنے لگے۔ لیکن مجھے بلاوا نہیں آیا۔ میرے بعد بھی کئی آدمی آئے۔ ان میں بیشتر کو ڈپٹی ڈائرکٹر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اپنی کسمپرسی سے میں نے بڑی بے بسی محسوس کی۔ ایک بے نکیل اونٹنی کی طرح بہکے بہکے خیالوں کا جوار بھاٹا مجھے ایک دفعہ پھر اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ اب کے میں وزیر خوراک کو فون پر شکایت کر رہا تھا۔ اچانک دفتر میں ایک زلزلہ آیا۔ ڈائرکٹر فوڈ اینڈ سپلائز کلرک کے ناروا برتاؤ پر مجھ سے معذرت کا اظہار کر رہا تھا۔ چند منٹوں میں طوطے کی چونچ جیسی ناک والا مختصر سا وجود ایک مجرم کی طرح ڈائرکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔

''لال! تم نے ایک معزز شہری کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔''

اس کی خمدار ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے اور ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میری انا کو تسکین ملی اور اس کے ساتھ میری فطری رحم دلی عود کر آئی۔

''ڈائرکٹر صاحب! آج اسے معاف کر دیجیے۔''

''نہیں صاحب! میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔''

''اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔ آئندہ یہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ مجھے ممنون بھری نظروں سے دیکھنے لگا اور میرا سپنا ٹوٹ گیا۔ کوریڈور میں میرے سامنے سے دو آدمی گزرے جن کے سامنے میں راشن کلرک کی ملامت کا ہدف بنا تھا۔

میں ایک دفعہ پھر ڈائرکٹر فوڈ کو اپنی شکایت پہنچانے کے لیے آخری کوشش کرنے کی نیت سے اس کے چیمبر کی طرف بڑھا۔ دروازے پر اب بھی کئی آدمی کھڑے تھے۔ چپراسی ایک نو وارد آدمی سے کہہ رہا تھا کہ اندر میٹنگ چل رہی ہے۔

اچانک دروازہ کھلا۔ چپراسی فوراً چوکس ہو گیا اور چلمن اٹھائی۔ ایک موٹا آدمی دروازے سے نمودار ہوا اور اس کے ساتھ وہ خوش پوش آدمی بھی تھا جو میرے سامنے پہلے کمرے میں گیا تھا۔ دروازے پر موجود کئی آدمی سلام کرتے ہوئے موٹے آدمی کی طرف لپکے لیکن وہ اُن کی طرف دھیان دیے بغیر تیزی سے گزرا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے کوریڈور میں کھڑے ایک آدمی سے پوچھا۔

''یہی تو ڈائرکٹر ہے۔''

''اور دوسرا؟''

''ایم ایل سی صاحب!''

کوریڈور سے گزرتے ہوئے دونوں باہر آئے۔ انہیں آتے دیکھ کر ڈرائیور نے تپاک سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور دونوں اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی فوراً چلی گئی اور پیچھا کرنے والے آدمی اپنے ہاتھ مل کر رہ گئے۔

مجھے راشن کارڈ کی بڑی ضرورت تھی۔ گھر میں چاول اور آٹا ختم ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے بھی میں دفتر کے تین دفعہ چکر کاٹ چکا تھا۔ اب میری رخصت اتفاقیہ بھی ختم ہو چکی تھی اور راشن کارڈ کے بغیر خالی ہاتھ گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا تھا۔

بوجھل قدموں سے میں راشن کلرک کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا ایک ایک قدم سو سومن کا لگ رہا تھا۔ بھیڑ ختم ہو چکی تھی۔ صرف چند آدمیوں نے راشن کلرک کو اپنے ہالے میں لے رکھا تھا۔ میرے لیے یہ نئے چہرے تھے۔ وہ لوگ اپنے کارڈ لے کر چلے گئے تھے جن کے سامنے مجھے ہدفِ ملامت ہونا پڑا تھا۔

جب بھیڑ چھٹ گئی تو میں آہستگی سے چلتا ہوا اس کی میز کے پاس جا کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ کارڈ چھانٹنے میں مگن تھا۔

اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے میں کھانسا کھکارا۔

دو دھنسی ہوئی آنکھوں نے چشمے کی آڑ سے مجھے دیکھا۔

"نام؟" اس نے پوچھا۔

"کاہن چند۔"

"مکان نمبر؟"

"۱۲ے۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک ریک میں رکھے راشن کارڈوں میں سے ایک راشن کارڈ کھنگال کر نکالا اور میرے حوالہ کرتے ہوئے کہا۔

"مانتا ہوں تم جوان ہو، جوشیلے ہو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ جوش یا غصے سے کوئی کام نہیں بنتا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

راشن کارڈ لے کر جب میں گیٹ سے باہر نکلا تو میرا دل بڑا ہلکا تھا اور مجھے کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔

(ایوانِ اردو، دہلی)



سوئمنگ پول

بارہ سال بعد روہت جب امریکہ سے لوٹا تو گھر کا ماحول بالکل بدلا بدلا پایا۔ پاپا کا کاروبار بڑھا تھا۔ وہ تھوک فروش تھا اور مقامی دکان داروں کو مال فراہم کرتا تھا۔ اب پاپا کا مال کئی شہروں کو جاتا تھا۔ ملازموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ پاپا نے ایک نئی کوٹھی تعمیر کی تھی۔ لیکن پاپا کی صحت اچھی نہیں تھی۔ ان کو ذیابیطس کا عارضہ تھا اور بی پی کی شکایت رہتی تھی۔ ممی تھل تھل موٹی ہوگئی تھی۔ ان کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا اور ٹھیک طرح سے چلا نہیں جاتا تھا۔ ایک مثبت تبدیلی یہ آئی تھی کہ پاپا اور ممی سال میں ایک یا دو مرتبہ کسی صحت افزا مقام پر جاتے تھے۔ روہت کو اس کا علم امریکہ میں ہوا تھا۔

پاپا نے گھر میں ایک جوان آدمی کو باورچی رکھا تھا۔ سفر میں وہ ان کے ساتھ رہتا تھا اور ان کی خدمت کرتا تھا۔ پرانا ڈرائیور رامو چچا موجود تھا۔ وہ گاڑی چلانے کے علاوہ چھوٹا موٹا گھریلو کام بھی کرتا تھا۔ پرانی نوکرانی نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک لڑکی لائی تھی۔ وہ برتن مانجھتی اور کمروں کی صفائی کرتی تھی۔

بارہ سال پہلے وہ پاپا کی ہدایت پر ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آیا تھا۔ کولمبیا میں وہ ایک کالج میں نیا نیا اسسٹنٹ پروفیسر لگا تھا۔ پاپا نے خط لکھا تھا کہ کاروبار بڑھا ہے۔ پاپا اکیلے سے سنبھالنا مشکل ہے۔ اس لیے اپنا کام چھوڑ کر فوراً آجائے۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تنخواہ ہی ضرورت ہے تو پاپا اس کو تین گنی تنخواہ دیں گے جو وہ امریکہ میں پاتا ہے۔ پھر پاپا کا فون آیا کہ جلدی گھر پہنچ جائے۔

روہت نے کام نہیں چھوڑا اور ماں کی بیماری کے بہانے چھٹی لے کر گھر پہنچا۔ ایک تو نئے نئے تقرر ملازم کو جھوٹ موٹ کہے بغیر چھٹی ملنا مشکل تھا۔

پاپا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کاروبار میں اضافہ ہوا تھا۔ تھوک میں پہلے سے زیادہ مال منگایا جاتا تھا اور زیادہ دکان داروں کو سپلائی کیا جاتا تھا۔ پاپا ایک مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ صحت اچھی تھی۔ سارا دن گودام اور دکان کے چکر میں گزارتا اور شام کو بھی کھاتا لکھنے میں مگن رہتا تھا۔ ممی خانہ داری میں مصروف رہتی تھی۔ کسی کو بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی لیکن سکون کا فقدان تھا۔ کوئی تفریح یا دلچسپ مشغلہ نہیں تھا۔

چند روز پاپا کے ساتھ کام کرنے کے بعد روہت کو محسوس ہوا کہ پاپا ٹیکس چوری کرتا ہے اور کالا روپیہ چھپانے کے لیے مختلف گر اختیار کرتا ہے۔

روہت نے بوریت محسوس کی۔ اس سے تو امریکہ کی مشینی زندگی ہزار درجہ بہتر تھی۔ ہر کام قاعدے سے ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں تفریح کا سامان ہے، سیر و سیاحت کے لیے وقت نکالا جاتا ہے۔ weekend پر بلاناغہ وہ اور اس کے دوست پکنک پر جاتے تھے۔

وہ ادب کا استاد تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اس کو ادب سے دلچسپی تھی۔ گریجویشن تک اس نے مغرب کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے ذوقِ مطالعہ کو دیکھ کر اور دوسروں سے اس کی تعلیمی قابلیت سن کر پاپا نے اس کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھیجا۔ اب وہ خود ادب پڑھاتا تھا۔

اس نے سوچا کہ یہاں منڈی کے غل غپاڑے میں صبح شام دال آٹے کا بھاؤ معلوم کرنا اور اس کا حساب کتاب رکھنا ہے۔ اسی الجھن میں اس کے بال ایک سال میں سفید پڑ جائیں گے اور وقت سے پہلے وہ مر جائے گا۔

وہ جانتا تھا کہ ادب پڑھنے اور پڑھانے میں اس کو کتنا سکون ملتا ہے۔ کتاب پڑھانے کا مطلب ہے دنیا کے ذہین ترین انسانوں کے بلند تخیل کی اڑان کے ساتھ خود بھی اڑان بھرنا ہے۔ ان کے فکر و نظر کی وسعتوں میں کھو کر موتی چننا اور پرونا ہے۔ چاہے شیکسپیئر کے معنی خیز مکالمے ہوں، رومی کا صوفیانہ پیغام ہو، ٹی ایس ایلیٹ کے دانشورانہ نقد و نظر ہو، عمر خیام کی

شراب و شباب سے بھری رباعیاں ہوں، کیٹس اور شیلے کا رومانی کلام ہو، جیمز جوئس اور سومرسٹ مام کی منظر نگاری ہو یا کافکا اور کامیو کے منفرد تصورات ہوں۔ ان کے ہر لفظ میں زندگی کی ہمک ہے۔ ہر جملہ میں علم و دانش مستور ہیں۔

یہاں کتاب کا مطالعہ کرنا تو درکنار، اخبار پڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ چھٹی ختم ہونے سے تین روز پہلے اس نے پاپا سے کہا کہ اس سے یہ کام نہیں ہوگا اور وہ بیمار پڑ جائے گا۔ پاپا بضد تھا کہ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ اس نے وضاحت کی۔ "پاپا! میں ایک ایسے ماحول میں پلا اور بڑھا ہوا ہوں، جہاں کتابیں ہیں، پڑھنا لکھنا ہے، یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے۔"

آخر کار پاپا نے اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ واپس روانگی سے پہلے اس نے پاپا اور ممی سے کہا کہ وہ اپنی مصروفیات میں آرام کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ ورنہ دن رات کی یہ مشقت ان کی صحت کو گھن کی طرح کھائے گی اور سال میں ایک آدھ بار سیاحت پر جایا کریں۔

ایک ماہ بعد وہ امریکہ لوٹا۔ اپنے طلبا اور طالبات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ان سے اس کا لگاؤ بڑھا تھا۔ اپنی ایک رفیقہ کار میری سے اس کو دلی اُنس تھا۔ میری بھی اس کی طرف مائل ہوئی تھی۔ چند ماہ بعد دونوں ایک ہی فلیٹ میں رہنے لگے۔ کچھ مدت بعد دونوں نے باقاعدہ شادی کرنے کا ارادہ کیا۔

شادی سے ایک ماہ پہلے اس نے پاپا کو فون پر اپنی شادی کی اطلاع دی۔ اور پاپا اور ممی کو شادی میں شرکت کرنے پر زور دیا۔ جس کے لیے وہ ان کے آنے جانے کی ہوائی جہاز کی ٹکٹیں بھیجے گا۔ پاپا نے ایک غیر ملک میں ایک غیر ملکی لڑکی سے شادی کرنے پر خفگی کا اظہار کیا اور فون بند کر دیا۔ اس نے دوبارہ فون کیا لیکن نہیں اٹھایا۔ بہن سے اس کو فون پر معلوم ہوا کہ ماں بھی اس شادی کے خلاف ہیں۔ البتہ بہن اور اس کا شوہر شادی میں شرکت کے لیے بمبئی سے امریکہ آئے۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد اس نے ممی کو فون کیا کہ وہ اور میری دسمبر میں سیاحت پر ہندوستان آ رہے ہیں۔ ممی بولیں۔ "تم اکیلے آؤ۔ اپنی امریکی گوری بیوی کو ساتھ نہیں لاؤ۔"

اس کے بعد اس نے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا۔ میری سمجھ دار تھی۔ اس نے پہلے ہی اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اس کے والدین اس شادی پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ اس کے سامنے اپنی ایک سہیلی کی مثال تھی۔

میری نیویارک سے تعلق رکھتی تھی، جہاں اس کے والدین کا اپارٹمنٹ تھا۔ شادی کے تین سال بعد ان کو نیویارک کے ایک کالج میں کام ملا جس کے لیے انہوں نے انٹرویو دیے تھے۔

اب بارہ سال بعد وہ اپنے ایک بچے کے ساتھ گھر لوٹا تھا۔ پاپا اور ماں دونوں نے لرزتی آواز میں اپنی گرتی ہوئی صحت کا زکر کیا تھا اور میری اور دو بچوں کے ہمراہ گھر آنے کی تاکید کی تھی۔

میری بھی اس کے ساتھ آنے والی تھی لیکن اچانک اس کی ماں بیمار ہوگئی اور اپنے آنے کا پروگرام ملتوی کیا۔

''رامو چچا، کمزور ہو گئے ہو۔ صحت اچھی ہے نا؟'' روہت نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں چھوٹا صاحب!''

''عمر کیا ہے؟''

''ستر سال ہوئے ہیں صاحب!''

''بیٹیوں کی شادی ہوئی؟ تین یا چار بیٹیاں تھیں۔''

''چار بیٹیاں ہیں چھوٹا صاحب۔ ایک کی شادی ہوئی۔''

''جن بیٹیوں کی شادی نہیں ہوئی ہے ان کی عمر کیا ہوگی چچا؟''

رامو چچا نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور بولا۔

''بتیس سے سینتیس سال کے درمیان ہوگی چھوٹا صاحب۔''

''کیا پاپا آپ کی مدد کرتا ہے؟''

''تنخواہ ملتی ہے چھوٹا صاحب!''

''تنخواہ تو آپ کو اپنے کام اور اپنی محنت کے لیے ملتی ہے۔ آپ ہمارے پریوار کے ایک

ممبر کی طرح ہیں چچا۔ کتنے سال ہوئے یہاں کام کیے؟"

"چھبیس سال ہو رہے ہیں صاحب!"

"آپ کی بیٹیوں کی شادی کے لیے پاپا کو آپ کی مدد کرنی چاہیے تھی۔"

"ڈاکٹر صاحبہ جب بھی یہاں آتی ہیں مجھے کچھ نہ کچھ دیتی ہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی پر وہ یہاں آئی تھیں۔ انہوں نے ہماری بڑی مدد کی۔"

"ہاں جیوتی مدد کرتی ہوگی۔ پاپا کو آپ کا خیال رکھنا چاہیے۔ لڑکیوں کی عمر زیادہ ہے۔"

"ہاں چھوٹا صاحب۔ بن بیاہی لڑکیاں ماں باپ کے لیے بڑا بوجھ ہیں۔"

"میں پوچھنا بھول گیا۔ ان کی ماں کیسی ہے؟"

"ابھی ٹھیک ہے چھوٹا صاحب۔ پچھلے سال سخت بیمار ہوئی تھی۔"

"رامو چچا، آپ کی بڑی بیٹی کا شوہر کیا کرتا ہے؟"

"وہ ایک دفتر میں چوکیدار ہیں صاحب۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"دو بچے ہیں چھوٹا صاحب۔"

"بیٹی خوش ہے نا؟"

"شروع میں وہ اکثر روٹھ کر آجاتی تھی۔ ہم سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیتے تھے۔ اب تو نہیں آتی ہے۔"

"وہ نئی لڑکی یہاں کب سے ہے چچا؟"

"جمنا! اس کو پانچ سال ہوئے ہیں چھوٹا صاحب۔"

"وہ اداس اداس سی لگتی ہے۔"

"ہاں چھوٹا صاحب۔" رامو چچا بولا۔ "اس کی اپنی سمسیائیں ہیں۔"

"کیا سمسیائیں ہیں؟"

"اس کے باپ اور بھائی دونوں بیمار ہیں۔"

پاپا اور اماں اپریل میں کشمیر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان کو تین فائیو اسٹار ہوٹل

اوبرائی پیلیس، ویدانتااور براڈوے میں ایک کوانتخاب کرنا تھا۔آخر پاپا کی حسب خواہش منشی نے کمپیوٹر پر ویدانتا سے رابطہ قائم کیا اور بیس روز کے لیے بکنگ کی۔

''کیا سوئمنگ پول ہے؟'' پاپا نے منشی سے پوچھا۔

''سوئمنگ پول کس لیے؟'' روہت نے پوچھا۔

''ہونا چاہیئے۔'' پاپا بولے۔

''پاپا، آپ نے زندگی میں کبھی تیراکی نہیں کی ہے۔اس عمر میں آپ ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں پا رہے ہیں۔''

''ہوٹل بلندی پر واقع ہے اور جھیل ڈل کا خوبصورت نظارہ ہے۔'' منشی نے کمپیوٹر پر ہوٹل کی تصویریں دکھائیں۔

روہت نے منشی سے کرایہ پوچھا۔

''یومیہ سترہ ہزار روپے ہیں۔'' منشی بولا۔

''اس حساب سے کھانا بھی بڑا مہنگا ہوگا۔'' روہت نے دل ہی دل میں سوچا۔

پاپا نے ایک ماہ کی سیاحت کا پروگرام بنایا تھا۔گلمرگ میں خیبر ریزورٹس اور پہلگام میں ہوٹل پہلگام میں بکنگ کی۔ پاپا اور ممی زیادہ دن سرینگر میں آرام کرنا چاہتے تھے۔

''اس سیاحت پر کم سے کم چھ سات لاکھ روپے خرچ ہونے چاہئیں۔'' روہت نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔

ایک روز روہت نے جمنا سے کرید کرید کر پوچھا۔

باپ دمہ کا مریض تھا۔ڈرائیور کا کام کرتا تھا۔ بیٹے کو گردے کی بیماری تھی۔ علاج سے ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ باپ نے اپنے اور بیٹے کے علاج کے لیے اپنا آٹو رکشہ بیچ دیا تھا۔ ایک گردہ بدلنے کی ضرورت تھی۔ جمنا بھائی کو اپنا گردہ دے رہی تھی لیکن آپریشن کے لیے رقم نہیں تھی۔

ماں نے روہت کو جمنا سے باتیں کرتے دیکھا تو ٹوکا اور بلا کر کہا۔ ''روہت! نوکروں سے اس طرح منہ نہیں لگانا چاہیئے۔''

ماں نے بارہ سال پہلے بھی اس کو رامو چچا اور پچھلی نوکرانی سے باتیں کرتے دیکھ کر ٹوکا تھا۔ اب کے روہت خاموش نہیں رہا اور بولا۔ ''اماں، یہ ہمارے کنبے کا حصہ ہیں۔ ہماری خدمت کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ان سے پوچھا کہ ان کے کیا مسائل ہیں۔ یہ کتنی مصیبتیں جھیل رہے ہیں۔ انہیں ہماری مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ ایشور نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ ہمیں پُن کا کام بھی کرنا چاہئے۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے؟ پاپا نے اب تک شری امرناتھ مندر کو دو کلو سونا چڑھایا ہے۔ پاپا کئی ٹرسٹ کی مدد کرتے ہیں اور دان بھی دیتے ہیں۔''

''یہ بات اچھی ہے اماں، لیکن ہمیں دان اپنے گھر سے شروع کرنا چاہئے۔'' روہت بولا۔

اسی اثناء میں بمبئی سے جیوتی پہنچی۔ روہت اور جیوتی میں فون پر اکثر باتیں ہوتی تھیں۔ دونوں کی سوچ میں گہری یکسانیت تھی۔

جیوتی نے روہت سے پوچھا۔ ''بارہ سال بعد گھر لوٹے ہو۔ کیا نقشہ دیکھا؟ کیا تبدیلی پائی؟''

''میں نے خاص بات یہ دیکھی کہ پاپا اور اماں اپنے لیے اچھا خاصا خرچ کرتے ہیں۔ سیاحت پر جاتے ہیں اور مہنگے سے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔''

''یہ صحیح ہے۔'' جیوتی نے تائید کی۔ ''اپنی ذات اور اپنی آسائش کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ پہلے وہ ننانوے کے پھیر میں رہتے تھے اور ایک ایک روپیہ بچانے کے چکر میں رہتے تھے۔''

روہت بولا۔ ''میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں برسر روزگار ہیں۔ دھن دولت بنانے کے چکر میں نہیں پڑے ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ ہے کہ اس بے بہا دولت کا کیا حشر ہوگا، جو انہوں نے اپنی زندگی میں بنائی ہے۔ اس لیے وہ باقی ماندہ زندگی اپنی ذات پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہتے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' جیوتی نے تائید کی۔

''جیوتی، اپریل میں وہ ایک ماہ کے لیے کشمیر کی سیاحت پر جا رہے ہیں۔ اعلیٰ اور مہنگے ہوٹلوں میں ٹھہر رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس پر چھ سات لاکھ روپے سے کم خرچ نہیں آئیں گے۔ جیوتی! ایک دلچسپ بات سنو۔ جس ہوٹل میں وہ قیام کر رہے ہیں، پاپا وہاں

سوئمنگ پول چاہتے ہیں۔''

جیوتی کھلکھلا کر ہنسی۔''کیا پاپا سوئمنگ پول میں تیریں گے؟ انہیں بالکل تیرنا آتا نہیں ہے۔''

''آج تو وہ ٹھیک طرح چل نہیں پاتے۔'' روہت بولا۔''سہارا دینا پڑتا ہے۔''

جیوتی بولی۔''پاپا اور اماں لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں آرام سے کشمیر کی ایک ماہ کی سیاحت کر سکتے ہیں۔ بچی ہوئی رقم کسی اچھے کام میں صرف کر سکتے ہیں۔''

روہت بولا۔''پاپا اگر فاضل رقم رامو چچا پر صرف کریں تو اس کی تین بن بیاہی بیٹیوں کی شادیاں ہو سکتی ہیں۔ جن کی ڈھلتی جوانی کا غم رامو چچا کے چہرے پر پڑھا جا سکتا ہے۔ شاید اسی رقم سے جمنا کے بھائی کو نیا گردہ مل سکتا ہے یا اس کے بیمار باپ کا علاج ہو سکتا ہے۔''

تھوڑے سے توقف کے بعد جیوتی بولی۔''ہمیں پاپا اور اماں کو سمجھانا چاہئے۔''

دونوں نے انٹرنیٹ دیکھا اور دو تین ایجنسیوں سے رابطہ قائم کیا جن سے بڑی رقم بچتی تھی۔

پھر دونوں نے پاپا اور اماں کو سمجھایا کہ وہ بہت کم رقم پر آرام سے کشمیر کی سیاحت کر سکتے ہیں۔ رامو چچا اور جمنا کو ان کی مدد کی بڑی ضرورت ہے۔ بچائی ہوئی رقم ان پر صرف کریں تو ان کا بھلا ہوگا۔ ان کے دیرینہ مسائل حل ہوں گے اور ان کی زندگی بدل جائے گی۔ بھگوان خوش ہوگا۔ رامو چچا اور جمنا دعائیں دیں گے اور آپ کے من کو شانتی ملے گی۔

روہت نے کہا۔''میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ تب تک میری بھی پہنچتی ہوگی۔''

''میں بھی شامل ہونے کی کوشش کروں گی۔'' جیوتی بولی۔

پاپا بولے۔''بیٹا ہم نے ہوٹلوں کی بکنگ کی ہے اور پیشگی رقم ادا کی ہے۔''

''کل بیس ہزار روپے پیشگی دیئے ہیں۔ یہ آپ کے سرینگر کے ایک دن کے خرچ کی رقم سے کم ہے۔'' روہت بولا۔

منشی نے پاپا کی ہدایت پر ساری بکنگ منسوخ کیں۔

(شیرازہ، سرینگر)

OO

گمشدہ

اب کے عید عطیہ کے لیے اندوہ سے بھری ہوئی تھی۔ زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ گھر کے در و دیوار پر غم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ہر چیز سونی سونی لگ رہی تھی۔ ننھا رضوان بھی اُداس اُداس سا نظر آتا تھا۔ اپنی توتلی زبان میں وہ ایک کھلونے کو دیکھ کر ابا ابا بول رہا تھا۔

پچھلی عید پر ابا نے اس کو مارکیٹ لیا تھا اور وہیں سے ریڈی میڈ کوٹ، پینٹ اور سر پر پی کیپ ٹوپی پہنا کر گھر لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت کھلونا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ عید پر وہ عطیہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لاتا تھا۔

ابا جب دفتر سے آتا تو رضوان کے لیے چاکلیٹ، کھلونا یا کوئی چیز لے آتا تھا۔ گھر میں کھلونوں کا ایک انبار سا لگا تھا۔

چار ماہ پہلے وہ اچانک غائب ہوا تھا۔ وہ کسی سے ملنے گیا تھا۔ اس دن ابا نے اپنا نیا سوٹ زیب تن کیا۔ اس کی قمیص کا کالر ایک طرف سے لپٹا ہوا تھا۔ عطیہ نے اسے ٹھیک کیا اور ندیم کے سراپا پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ندیم جانتا تھا کہ عطیہ کو یہ سوٹ بڑا پسند ہے۔

''ندیم! جلدی واپس آنا۔''

''میں دو اڑھائی گھنٹے بعد لوٹوں گا۔'' ندیم نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر مسکرا کر کہا۔

کچھ توقف کے بعد عطیہ نے مارکیٹ کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی کے قد آدم شیشے کی آڑ سے دیکھا کہ ندیم چوراہے پر پہنچا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہی اور چوراہے سے آگے موڑ پر غائب ہوا۔

وہ جب سے اس مکان میں آئی تھی، اس کی نظر ارادی اور غیر ارادی طور پر چوراہے پر پڑتی تھی جہاں سے اس نے متعدد بار ندیم کو آتے جاتے دیکھا تھا۔

دو اڑھائی گھنٹے بعد لوٹنے کا وعدہ کرنے والا ندیم اس رات گھر نہیں لوٹا۔ انتظار میں عطیہ نے رات آنکھوں میں کاٹی، ایک لقمہ بھی منہ میں نہیں گیا۔ بھوک بالکل ختم ہوگئی تھی۔ اس کی ماں اور بھائی اس کے پاس رہنے کے لیے آئے۔ ندیم کی ماں اس کی کمسنی میں چل بسی تھی اور باپ نے ایک سال پہلے داغِ مفارقت دیا تھا۔

ندیم نے نہیں بتایا تھا کہ وہ کس سے ملنے جارہا ہے اور کہاں جارہا ہے۔

صبح پولیس اور ڈی سی کو گمشدگی کی رپورٹ دی۔ ندیم کے دوستوں اور دفتر رابطہ قائم کیا۔ ندیم کے بارے میں انہیں کچھ علم نہیں تھا۔

عطیہ کے دل میں جو وسوسے تھے، وہ خدشات میں بدل گئے۔

ایک دفعہ کسی نے ایک شخص کی گمشدگی پر اس کو کہا تھا کہ جو ایک دفعہ گم ہوجاتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آتا ہے۔ اعزا و اقارب اور ہمدردوں کا دلاسہ اس کو خالی خولی لگا۔

دن گزرتے گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ آخری تصویر بار بار گھومنے لگی۔ جب ندیم نے اس کا پسندیدہ سوٹ پہنا۔ اس نے قمیص کا کالر ٹھیک کیا۔ ندیم نے مسکرا کر کہا کہ وہ دو اڑھائی گھنٹے بعد لوٹے گا۔ اس نے شیشے کی آڑ میں سے ندیم کو چوراہے پر سے جاتے ہوئے دیکھا اور موڑ پر غائب ہوا۔

مایوسی کے عالم میں بھی وہ اس اُمید پر ایک ایک دن گزارنے لگی کہ ندیم اچانک نمودار ہوگا۔ اچانک اس کی آواز سنائی دے گی۔ اس کے کانوں میں مدھر بھرا رَس گھول دے گی۔ یہ آواز اس کو کتنی پیاری تھی۔ کتنی خوش آئند تھی۔ خاص کر جب اس آواز میں اس کا نام گھلا ہو۔ وہ اس آواز کے لیے ترسنے لگی۔ کاش! ایک دفعہ وہ اس آواز کو سن لیتی۔ یہ ایک معجزہ ہوتا۔ اس نے حسرت سے سوچا۔ وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگتی۔ وہ اُمید و بیم سے چوراہے کی طرف دیکھتی اور اس کی مایوس نظریں لوٹ آتیں۔

اس کے شوہر کا نام بھی اب لاپتہ افراد کے ناموں میں شامل ہوگیا تھا۔ وہ ہر وقت روتی

رہتی۔ ''میں کیوں زندہ رہی؟ ساتھ کیوں نہیں مرگئی؟'' اس کو زندہ رہنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ یہ تو رضوان تھا جس کے لیے وہ جی رہی تھی۔

ماں بار بار کہتی۔ ''اس طرح رونے دھونے سے بینائی چلی جائے گی۔ ہم جانتے ہیں۔ یہ بڑی آزمائش ہے۔ اس بچے کے لیے جیو۔ اگر تم بیمار ہو تو کوئی اور اس بچے کو اتنا پیار نہیں دے سکتی جتنا تم دیتی ہو۔''

ایک سال بیت گیا۔ اس دوران اس نے گمشدہ افراد کے ساتھ دو مظاہروں میں حصہ لیا۔ ایک مرتبہ بھاری دل کے ساتھ پریس انکلیو میں ندیم کی تصویر سینے سے لگائے بیٹھی رہی۔ اُدھر اس کے بھائی نے جیل خانوں میں اپنے بہنوئی کی تلاش کی۔

ایک دفعہ چند لاپتہ لاشوں میں اپنے شوہر کی لاش کی شناخت کے لیے اس کو اچانک جانا پڑا۔ یہ بڑی جانکاہ آزمائش تھی۔ دو عورتوں نے اس کے بازوؤں کو تھام لیا تھا۔ لاش ندیم کی نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ اگر لاش ندیم کی ہوتی تب بھی بے ہوش ہوگئی ہوتی۔

وہ اکثر تنہائی میں سوچتی کہ ندیم کیسے مرا ہوگا؟ کس نے مارا ہوگا؟ کیوں مارا ہوگا؟ اس کا کیا قصور تھا؟ لیکن جیسے بھی مرا ہوگا، رضوان کو دل میں لے کر وہ مرا ہوگا۔ کتنا پیار تھا اس کو رضوان سے!! یہ سوچ کر اس کا کلیجہ منہ میں آتا۔

اس کی نظر جب بھی چوراہے پر پڑتی، اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی تھی۔ اس نے ان بڑے شیشوں کو چلمن سے ڈھانپ لیا۔ انہی کی آڑ سے اس نے ندیم کے انسانی ہیولے کو آخری مرتبہ موڑ پر اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

دو سال گزر گئے۔ ماں اور خالہ نے اس کو دوسری شادی کرنے کا اشارہ دیا۔

''امی! دوسری شادی کی بات بالکل نہیں کرو۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

عطیہ نے ایک پرائیویٹ اسکول میں بطور استانی کام کیا۔ بینک میں ندیم کے نام کچھ رقم جمع تھی۔ وہ اب تک اس بچت کھاتے پر گزارہ کرتی رہی تھی۔

رضوان اب انیس سال کا ایک گبرو جوان تھا۔ عطیہ نے اس کو اچھی تعلیم دی تھی۔ اس

نے اب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اپنے والد کی تصویر دیکھتا ہوا وہ جوان ہوا تھا۔ عطیہ ہمیشہ کہتی تھی کہ وہ اپنے باپ پر گیا ہے۔ رضوان کو اپنے باپ کی دھندلی سی یاد تھی۔ وہ بھی کھلونوں کی وساطت سے۔ جب ابا اس کو خوبصورت کھلونے لاتا تھا۔ ربڑ کا خرگوش، چابی دینے سے ناچتا تھا۔ لمبوتری ٹوپی پہنا ہوا ایک آدمی ڈھول بجاتا ہوا رقص کرتا تھا۔ ہیلمٹ پہنا ہوا ایک سپاہی چابی دینے سے سلامی دیتا تھا۔ ایک روز ماں اسکول سے ایک لڑکی کے ہمراہ گھر آئی۔ پہلی نظر میں رضوان کو وہ اچھی لگی۔

''پیپر کیسا تھا؟'' اس نے رضوان سے پوچھا۔

''آسان تھا۔'' رضوان نے جواب دیا۔

''امی نے اس کو میرے امتحان کے بارے میں بتایا ہوگا۔'' رضوان نے دل ہی دل میں سوچا۔

وہ بھی ماں کے اسکول میں استانی تھی۔

لڑکی کے چلے جانے کے بعد رضوان نے محسوس کیا کہ لڑکی اس کے دل و دماغ پر ایک نقش چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اس کو پسند کرنے لگا۔ تاہم اس نے لڑکی کے بارے میں ماں سے کوئی بات نہیں کی۔

''امی سے میں اس کا ذکر کس منہ سے کروں!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''امی نے بڑی صعوبتیں جھیلی ہیں، شادی کے تین سال بعد ابا کو کھویا ہے۔ ابا کی فرقت میں جلتی رہی ہیں۔ ابا کے پیار اور میری خاطر شادی نہیں کی ہے۔ ابا کی یاد کو اپنا سرمایہ حیات بنایا ہے۔ وقت سے پہلے ان کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ مجھے امی کا دل دکھانا نہیں چاہئے۔''

کئی دفعہ اس نے ماں کو چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔ جب رضوان آتا تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیتی۔

وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ کیوں کر ماں کی دلجوئی کرے۔ اس کو دلاسہ دے۔ اس کے زخموں پر پھاہا رکھے۔

ایک روز ماں کو آنسو پونچھتے دیکھ کر وہ بولا۔ ''امی یہ زندگی چند روزہ ہے۔ دائمی زندگی تو

آخرت ہے، جہاں آپ اپنے جنت مکانی ابا سے ملیں گی۔ امی، آپ خدارا مت روئیے۔ آپ کو روتے دیکھ کر میرے دل پر آری سی چلتی ہے۔"

لیکن رضوان اس لڑکی کو بھول نہیں سکا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کی یاد آنے لگتی۔ وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔

آخر ایک روز اس نے اپنی امی سے پوچھ لیا۔

"امی، وہ لڑکی کیا پڑھاتی ہے جو آپ کے ساتھ یہاں آئی تھی؟"

"انگریزی!"

"کب سے آپ کے اسکول میں ہے؟"

"اسی سال اپریل میں اس کا تقرر ہوا۔"

"یہاں کیسے آئی؟"

"کیسے! کیا مطلب ہے۔ نجمہ کراسنگ پر رہتی ہے۔ کبھی ہم اسکول سے ساتھ نکلتے ہیں۔"

رضوان نے گھر آنے جانے کے لیے کراسنگ کا راستہ اختیار کیا۔ اگرچہ اسے اس کو کچھ زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔

ایک روز نجمہ سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔

"آپ نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا۔" اس نے گلہ کیا۔

"میں آؤں گی۔" نجمہ بولی۔

پھر ایک دن نجمہ اس کی ماں کے ہمراہ اس کے گھر آئی۔

دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

رضوان نے ایم اے میں انگریزی لٹریچر لیا تھا۔ نجمہ کو بھی ادب سے دلچسپی تھی۔

جب نجمہ اُٹھی تو رضوان اس کو چھوڑنے دروازے تک آیا۔

"نجمہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" جدا ہوتے وقت رضوان بولا۔

نجمہ مسکرا کر رہ گئی۔

ایک روز نجمہ نے بھی جواب دیا۔ "آپ بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

ایک دن امی نے نجمہ کی والدہ سے کہا کہ نجمہ اور رضوان ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔

عطیہ کی آنکھوں کے سامنے بائیس سال پہلے کی زندگی کا نقشہ آیا، جب یونیورسٹی کیمپس میں ایک معصوم سا شرمیلا لڑکا اسے ملا۔ عطیہ کو ایسا لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ جب بھی ان کا آمنا سامنا ہوتا، عطیہ کو محسوس ہوتا کہ اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں۔

عطیہ اس لڑکے کو غیر شعوری طور پر پسند کرنے لگی تھی۔

یہ لڑکا ندیم تھا۔ پھر ایک دن اُس لڑکے کے گھر والوں کی طرف سے شادی کا پیغام آیا۔

رضوان نے ماں کے سامنے پھر کبھی نجمہ کا ذکر نہیں کیا۔ ایک شام ماں اور بیٹا دونوں گھر میں تھے۔ ہمیشہ کی طرح ماحول اُداس اُداس تھا۔ دو دہے گزرنے کے باوجود عطیہ شوہر کی گمشدگی کے سانحے کو نہیں بھولا تھا۔ تپائی پر فریم میں سجائی ندیم کی مسکراتی ہوئی تصویر نے ان کی یاد کو ہمیشہ فروزاں رکھا تھا۔ خوشی کے ہر موقع پر ندیم کی محرومی کو وہ زیادہ محسوس کرتے تھے۔

عطیہ نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں نجمہ اچھی لگتی ہے نا؟ اچھی لڑکی ہے۔ میں نجمہ کی ماں سے رشتہ پختہ کر لیتی ہوں۔''

''نہیں امی، میں شادی نہیں کروں گا۔'' رضوان یک لخت بولا۔

عطیہ حیرت سے رضوان کو دیکھنے لگی۔ ''ارے کیوں؟''

''امی، آپ نے ابا کے بغیر اتنے سال گزارے ہیں۔'' رضوان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں۔

''شادی کے دو سال بعد ابا آپ سے جدا ہوئے۔ آپ نے ابا کو ایک لمحہ بھی نہیں بھولا۔ میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ ابا کی یاد اور میری زندگی کی خاطر آپ نے اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی خوشیاں قربان کیں۔ آپ نے ہمیشہ اپنا غم مجھ سے چھپایا ہے۔ میں آپ کو سمجھتا ہوں۔ میں نجمہ کو چاہتا ہوں، پیار کرتا ہوں لیکن میں شادی نہیں کروں گا۔ آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔''

رضوان رونے لگا۔

عطیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عطیہ کے درد کے سارے ٹانکے یک لخت کھل گئے اور جذبات کا لاوا پھوٹ پڑا۔ ماں اور بیٹے نے ہمیشہ اپنے جذبات کو چھپا رکھا تھا۔ کبھی اس طرح کھل کر باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی اس طرح نہیں روئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔

دیر تک دونوں سسکیاں بھرتے رہے۔ دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

آخر کار ماں بولی۔ ”رضوان! تم شادی کرو گے، ضرور کرو گے بیٹا۔ اس سے مجھے بڑا سکون ملے گا۔ تم باپ جائے ہو، باپ کی نشانی ہو۔ باپ کی یادگار ہو۔ تمہاری شادی سے ہمارے گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ اس گھر کے اندھیارے میں اُجالا آئے گا۔ میں اس دن کے لیے انتظار کرتی رہی ہوں۔ جب تم اس گھر کو آباد کرو گے، ابا کی روح کو بھی اس سے سکون ملے گا۔

رضوان سسکیاں بھرنے لگا۔

(کشمیر عظمیٰ، سرینگر)



برتھ ڈے

''ہپی برتھ ڈے ٹو یو جوجو! ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

ٹریکنگ پر آئے چھوٹے سے گروپ کے یورپی سیلانی زور زور سے بولنے لگے۔

اسمتھ بولا۔ ''میں نے زندگی میں بہت سارے برتھ ڈے منائے ہیں۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے جب آسمان تلے ایک دلکش ویرانے میں کسی کی سالگرہ میں شریک ہوا ہوں۔''

گروپ لیڈر جیکسن بولا۔ ''تم اکیلے نہیں ہو اسمتھ۔ ہم سبھوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہے۔''

ہاورڈ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم جگمگاتے ڈرائنگ روموں اور آرام دہ دیوان خانوں میں برتھ ڈے منانے کے عادی ہیں۔ جہاں میز پر لذیذ اور مرغن پکوان سجائے جاتے ہیں۔''

''بہر حال جوجو نے جو اسنیکس لائے ہیں وہ بھی کم مزیدار نہیں ہیں۔'' نیلسن بولا۔ ''میرا خیال ہے برتھ ڈے منانے کے لیے یہ ایک بہتر جگہ ہے۔ قدرت نے اس جگہ کو حسن و جمال سے نوازا ہے۔''

کچھ دیر پہلے جوجو نے اپنے کلام چلاؤ انگریزی میں گروپ کو اس جگہ کی مختصر تاریخ بتائی تھی۔ ان کے سامنے دور تک ہری ہری دوب کا سبز میدان پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ایک پہاڑی پر ایک گنبد نظر آرہا تھا۔ عقب میں ایک ٹیلے پر ایک پرانے قلعے کا کھنڈر تھا۔ دور حد نظر ایک ننگے پہاڑ کے پیچھے ایک برفانی کوہسار کی چوٹی نظر آرہی تھی۔ اُن کا کیمپ ایک خوبصورت مقام پر تھا

جس کے سامنے ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔

سیلانی خیموں سے نکل کر دوب پر جا بیٹھے۔ سامنے پولی تھین کے دسترخوان پر جوجو نے پلیٹوں میں بسکٹ، کیک اور مٹھائیاں رکھی تھیں۔

''جوجو! بتیاں بجھاؤ۔'' جیکسن بولا۔

جوجو نے پھونک ماری اور تینوں بتیاں بجھ گئیں۔

سبھی زور زور سے بولنے لگے۔ ''ہپی برتھ ڈے ٹو یو جوجو! ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

گروپ میں چھ انگریز اور ایک جرمن تھا۔ جوجو باورچی تھا اور کھانا پکانے کے علاوہ گائڈ کا کام بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دو ٹٹو والے تھے جو سفر کے دوران چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ ٹٹوؤں پر راشن اور سامان ڈھویا جاتا تھا۔

جوجو نے سفر کی شروعات میں جیکسن کو بتایا تھا کہ ۷ رجولائی کو اُس کا جنم دن ہے، جب گروپ آسمان تلے ایک سبز میدان میں رات بسر کرے گا۔

گروپ کے ہر فرد نے جوجو کو جنم دن پر تحفے دیئے۔ الیگزینڈر نے جوجو سے کہا کہ وہ لیہ پہنچ کر اپنا تحفہ پیش کرے گا۔ وہ واحد جرمن تھا۔ اُس نے اَیے میں جوجو سے کہا۔ ''تمہارا جوتا پھٹ گیا ہے۔ لیہ پہنچ کر میں اپنا یہ ٹریکنگ شو تمہیں بطور تحفہ پیش کروں گا۔ کیوں منظور ہے؟''

جوجو مسکرا کر پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوا بولا۔ ''سر! میرے لیے یہ سب سے قیمتی تحفہ ہے۔''

''تم بہت اچھا کھانا بناتے ہو جوجو۔'' ڈنر پر نیلسن نے کہا۔

''جوجو کے کھانے کو ہر ایک پسند کرتا ہے۔'' جیکسن بولا۔

''آج کا دن ہمارے لیے بہت اچھا رہا۔ صبح ہم نے ایک برفانی چیتا دیکھا۔'' اسمتھ بولا۔ ''پھر لمبے لمبے سینگوں والے جنگلی بھیڑوں سے ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ اور سہانی دھوپ میں ہم نے جوجو کی سالگرہ منائی۔''

جوجو نے کھڑے ہو کر سب کا شکریہ ادا کیا۔ لیہ پہنچ کر جیکسن نے گروپ کے افراد کی طرف سے جوجو اور ٹٹو والوں کو محنتانہ کے علاوہ بخشش دی۔

جوجو نے گروپ کو دعوت دی کہ اتوار کو لنچ اُس کے گھر پر کھائیں اور بڑی انکساری سے

ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سبھی اس کے غریب خانہ پر آنے کی زحمت کریں۔

جوجو کا مکان لیہ کے نواح میں تھا۔ اتوار کی صبح اُس نے بیٹھک میں سے رنگین ٹی وی، فریج اور قیمتی قالین اُٹھوا کر ایک دوسرے کمرے میں ڈالے اور مہمانوں کو لینے کے لیے لیہ آیا۔

جوجو کی بیوی نے دروازے پر مہمانوں کا استقبال کیا۔ جوجو نے مہمانوں کو اپنی بچی سے ملایا۔

''تمہارے کتنے بچے ہیں جوجو؟'' ہاورڈ نے پوچھا۔

''تین بچے ہیں سر! بڑا لڑکا اور منجھلی لڑکی اسکول گئے ہیں۔ لڑکا پانچویں میں اور لڑکی تیسری میں پڑھتی ہے۔''

''سردیوں میں تم کیا کرتے ہو؟'' نیلسن نے پوچھا۔

''کوئی خاص کام نہیں ہے سر! کبھی چادر کے راستے زنسکار جانے والے کچھ منچلے لوگ آتے ہیں۔ اُن کے ساتھ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی کے ہاں کھانا پکانے جاتا ہوں۔ اکثر چار پائی پر پرانے کپڑے بیچتا ہوں۔ ایک آدمی تھوک پر پرانے کپڑے لاتا ہے۔ وہ بیچنے کے لیے دیتا ہے۔ اس طرح کچھ پیسہ کما لیتا ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''ایک وطن چھوڑے ہوئے آدمی کے لیے کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔''

جیکسن اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

Jo Jo lives by his wits.

''پہلے میں سردیوں میں دہرہ دون جاتا تھا۔'' جوجو نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تب میری ماں زندہ تھی اور بھائی کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ اب میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میری ذمہ داری بڑھی ہے۔ ہوائی جہاز کا کرایہ بھی بڑھا ہے۔ اس لیے اب سردیوں میں یہیں رہتا ہوں۔''

لڑکا اور لڑکی اسکول سے پہنچے اور جوجو نے مہمانوں سے انہیں ملاتے ہوئے کہا۔ ''انہیں تعلیم کے لیے آپ جیسے نیک انسانوں نے sponsor کیا ہے۔'' اس نے صندوق میں سے چند چٹھیاں نکالیں اور انہیں دکھائیں۔ یہ چٹھیاں بچوں کے مربیوں نے بھیجی تھیں۔ پھر اس نے

اپنی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سر! اب مجھے صرف اس کی فکر ہے۔''

جانے سے پہلے جیکسن نے اپنے ساتھیوں کی طرف سے جوجو کو پولی تھین کی دو بڑی تھیلیاں پیش کیں جن میں کپڑے تھے۔ جوجو کی بیوی کو سینٹ کی ایک شیشی دی۔

دو ماہ بعد ٹریکنگ کی ایک خوبصورت گزرگاہ پر خیمے نصب تھے۔ پاس میں مخملیں گھاس پر ترپال بچھا تھا اور دسترخوان پر کیک، بسکٹ اور پیالیاں سجائی گئی تھیں۔ پانچ ٹریکر یکے بعد دیگرے دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔ یہ انگلینڈ اور امریکہ سے تعلق رکھتے تھے۔

''ڈیوڈ اور کرسٹوفر کہاں ہیں؟'' گروپ لیڈر مارٹین نے گھوڑے والے سے پوچھا۔ اُس نے جوجو کی طرف اشارہ کیا۔

''سر! وہ اس پہاڑی پر واقع محل دیکھنے صبح کو نکلے تھے۔'' جوجو نے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''سر! وہ آرہے ہیں۔'' پہاڑی کے دامن میں دو سیاہ نقطے نمودار ہوئے۔

مارٹین نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔

نقطے بڑے ہوتے گئے۔

ڈیوڈ اور کرسٹوفر پہنچ گئے۔

''جانے سے پہلے ہمیں بتایا ہوتا۔'' مارٹین بولا۔

''ہم نے جوجو سے کہا تھا کہ ہم جارہے ہیں۔''

''کیا قابلِ دید ہے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ جوجو بتا رہا تھا محل تین سو سال پرانا ہے۔''

''آؤ اس دلچسپ برتھ ڈے میں شامل ہو جاؤ۔'' مارٹین بولا۔

''کس کے برتھ ڈے میں؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''جوجو کے۔''

''جوجو کے؟'' ڈیوڈ نے اپنی آنکھیں پھیلا کر قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہاں جو جو کے۔'' مارٹین بولا۔ ''کیا اعتراض ہے؟''

''جو جو کا برتھ ڈے تو لگ بھگ دو ماہ پہلے منایا جاچکا ہے۔ مجھے ڈیڈی نے بتایا تھا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' مارٹین بولا۔

''ڈیڈی نے اُس کی تصویر بھی لی تھی۔ میں نے وہ تصویر اپنے البم میں سجا رکھی ہے۔ ایک دم جو جو ہے۔''

جو جو قدرے دور کھڑا تھا۔

''جو جو! یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟'' مارٹین نے اونچی آواز میں کہا۔ ''تمہارا برتھ ڈے تو دو ماہ پہلے ہو چکا ہے۔''

''کون کہتا ہے سر؟''

''ڈیوڈ بول رہا ہے۔ جانتے ہو ڈیوڈ کون ہے؟ ہاورڈ کا بیٹا ہے۔''

جو جو ایک لمحہ کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ سنبھل کر بولا۔ ''سر، وہ میرا بھائی ہوگا۔ ہماری شکل ایک دوسرے سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ لوگ اُس کو بھی جو جو کہتے ہیں۔''

''تمہارا بھائی؟ تم نے اپنے بھائی سے متعلق کبھی نہیں بتایا۔''

''سر، ہم دو جڑواں بھائی ہیں۔''

''جڑواں بھائی ہو تو ایک ہی دن اور ایک ہی تاریخ کو برتھ ڈے کیوں نہیں منایا؟'' مارٹین کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

(جدید فکر وفن، شملہ)



بدلاؤ

پروفیسر سریندر ناتھ نے انگریزی ادب کے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ نصاب کے علاوہ انہوں نے کون کون سے ناول پڑھے ہیں۔ ''میری مراد شاہکار ناول ہیں۔'' پروفیسر بولے۔ ''جو بڑے مقبول ہیں۔ مختلف زبانوں میں جن کا ترجمہ ہوا ہے اور انعامات ملے ہیں۔'' پروفیسر نے اپنے شاگردوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

ان کے چار شاگردوں نے اپنے پسندیدہ ناولوں کا ذکر کیا۔ ان میں سنیتا شرما پیش پیش تھی۔ اس نے انگریزی، روسی، فرانسیسی اور کئی زبانوں کے شاہکار ناول پڑھے تھے جن میں کئی ناولوں کو نوبل پرائز اور بوکر پرائز ملے تھے۔ پروفیسر نے سنیتا شرما کی تعریف کی اور کہا۔ ''صرف لطف اندوزی کے لیے ہی نہیں پڑھو بلکہ کچھ سیکھنے کے لیے پڑھو۔ ایک سنجیدہ قاری زبان کے علاوہ مصنف کی تخلیقی صلاحیت، تخیل کی اڑان، منظر نگاری اور کردار نگاری سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اور اس سے قاری کے تخلیقی مادہ کو جلا ملتی ہے۔

پھر پروفیسر دوسرے شاگردوں کی طرف راغب ہوئے اور یکے بعد دیگرے ہر ایک کو اپنا سوال دہرایا۔

سلیم کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس کی باری آئی۔

''ہاں، سلیم بتاؤ۔''

''سر، فیوڈر ڈوستووسکی کا جرم و سزا۔'' سلیم بولا۔

پروفیسر بولے۔ ''بڑا اچھا ناول ہے۔''

سلیم کی نظر چھلتی ہوئی ایک لمحہ کے لیے حمیرہ پر پڑی۔

''جرم وسزا کے مرکزی کردار کا کیا نام ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

سلیم کا چہرہ سرخ ہوا اور بولا۔''سر، اس ناول کو پڑھے ہوئے بہت دن ہوئے۔ مجھے یاد نہیں۔''

''کسی اور ناول کے اہم کردار کا نام بتا سکتے ہو؟''

''شرلوک ہومز۔'' سلیم بولا۔

''ہاں شرلوک ہومز، سرکینن ڈائل کے جاسوسی ناولوں کا مرکزی کردار ہے۔'' پروفیسر بولے۔

''خدا نے میری لاج رکھ لی۔'' سلیم نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کی نظر پھر حمیرہ پر پڑی۔

''شرلوک ہومز ایک شہرہ آفاق کردار ہے۔'' سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر نے کہا۔''ستم ظریفی ہے کہ اس کے برعکس اس کا مصنف سرکینن ڈائل گمنام ہے۔ ایک واردات میں جب مصنف نے شرلوک ہومز کی موت دکھائی تو لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ لندن میں اس کے پرستاروں نے جلوس نکالا اور مصنف کو اپنے سراغ رساں کیریکٹر کو ازسرنو زندہ کرنا پڑا۔ ہومز کے ان گنت شیدائی اپنے ہیرو کے نام پر ایک یادگار تعمیر کرنے کی مانگ کرتے آئے ہیں۔ جاپان اور سوئٹزرلینڈ میں اس کی مورتیاں نصب ہیں۔ لندن کے 221 بی بیکر اسٹریٹ میں شرلوک ہومز میوزیم ہے۔ اس پر 175 سے زیادہ فلمیں بنی ہیں۔''

پروفیسر اپنے شاگردوں میں بڑے مقبول تھے۔ وہ اپنا لیکچر نصابی کتابوں کی درس و تدریس تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ موضوع سے وابستہ دوسری معلومات فراہم کرتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ انگریزی پڑھنے کا مقصد درسی کتابیں پڑھا کر امتحان پاس کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد انگریزی کتابوں کی نگارشات سمجھنا، اس میں بات چیت کرنا اور لکھنے کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔

پروفیسر کے چلے جانے کے بعد امیت بولا۔'' آج کی مجلس کی ہیروئن سنیتا ہے۔''

''یہ تو چھپا رستم نکلی۔'' وجے نے تائید کی۔

''آج اس نے پڑھنے کے لیے کون سا ناول لیا ہے؟'' راشد نے پوچھا۔

''کچھ نہیں لیا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔صبح یہ بس میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔'' سنگیتا بولی۔

''اس کے بیگ کی تلاشی لو۔'' انل بولا۔

بملا نے بیگ چھین لیا اور بیگ سے کتاب نکال کر اسے گھما لہرا کر بولی۔

''اینا کرینا۔ لیوٹالسٹائی۔''

''جھوٹ نکلا۔'' حمیرہ بولی۔

''تم اپنا بیگ دکھاؤ۔'' سنیتا شرما بولی۔

''میں کہاں پڑھتی ہوں۔''

''حمیرہ خود ایک ناول ہے۔'' ماجد بولا۔

''کیا مطلب؟'' حمیرہ کی تیوری پر بل آئے۔

''میرا مطلب ہے ایک دلچسپ ناول کی خوبصورت ترین کیریکٹر۔''

''واہیات بکتے ہو۔'' حمیرہ غصے سے بولی۔

''ماجد سچ کہتا ہے۔'' سلیم نے زبان تک آکر اپنے الفاظ واپس لیے۔

سلیم نے ایک ہفتہ پہلے حمیرہ کو یونیورسٹی کے کیمپس میں چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ ماجد کے ہمراہ وہاں شہناز کو ایک کتاب دینے آیا تھا۔حمیرہ کے دلکش تیکھے نقوش دیکھ کر وہ اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ جب حمیرہ کھڑی ہوئی تو اس کا سڈول بدن اور لمبی قامت قیامت ڈھانے لگی۔ جب وہ مسکرائی تو اس پر بجلی سی گری۔

''کسی کسی پر قدرت کتنی مہربان ہوتی ہے۔ یہ لڑکی سراپا حسن ہے۔'' سلیم نے دل ہی دل میں سوچا۔

''شہناز کے ساتھ وہ لڑکی کون تھی؟'' اس نے ماجد سے پوچھا۔

''حمیرہ! اگر یہ لڑکی عالمی مقابلہ حسن میں حصہ لے تو یقیناً مس ورلڈ منتخب ہو سکتی ہے۔'' ماجد بولا۔

دوسرے روز پروفیسر سریندر ناتھ نے ایک نیا موضوع لیا۔

"جانتے ہو! ایک کامیاب ادیب اپنی تخلیق کے لیے کتنی ریاضت کرتا ہے۔"

انہوں نے اپنے منفرد انداز میں سوال کیا۔ اس کا جواب وہ خود دینے لگے۔

"افلاطون نے اپنی مشہور کتاب The Republic کے پہلے جملے کو دلکش اور دلنشیں بنانے کے لیے پچاس مرتبہ لکھا۔ ہمینگوے نے اپنے مقبول ناول A Farewell to Arms کا آخری صفحہ 39 مرتبہ لکھا۔ گولڈ اسمتھ چار مصرعہ لکھنا دن بھر کا کام سمجھتا تھا۔ ذین گیرے ایک کہانی لکھنے کے لیے مہینوں بلکہ ایک سال سے بھی زیادہ مدت محنت کرتا تھا۔ وہ اسے بار بار دیکھتا۔ کرداروں کو بدلتا۔ پلاٹ میں تبدیلی لاتا اور پھر اسے پڑھتا تھا۔ کارل مارکس نے Das Capital کی تصنیف کے سلسلے میں پندرہ سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس پر چالیس سال کام کیا..."

پروفیسر مثالوں پر مثالیں دینے لگے۔

ایک دن حمیرہ ایک لڑکی کے ہمراہ کلاس سے آ رہی تھی۔ شوخ رنگ کے سوئٹر میں وہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سلیم نے سوچا۔ "ہر لباس اس کے بدن پر پھبتا ہے وار ہر زاویہ سے وہ دلکش نظر آتی ہے۔"

"کیا پروفیسر صاحب کلاس میں ہیں؟" اس نے حمیرہ سے پوچھا۔

"خود جا کر دیکھ لو۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"حمیرہ! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اخلاق سے بات کرو۔ کیا سوال کا اس طرح سے جواب دیا جاتا ہے۔" حمیرہ کے ساتھ والی لڑکی نے ڈپٹ پلائی۔

"آپ اس کی بات کو برا نہ مانیں۔" اس نے سلیم سے معذرت کا اظہار کیا۔

"نہیں، میں نے برا نہیں مانا۔"

"پروفیسر صاحب کلاس میں نہیں ہیں۔" لڑکی بولی۔

"آپ سے تعارف نہیں ہے۔" سلیم مجسم سوال بن گیا۔

"مجھے منیرہ کہتے ہیں۔"

سلیم نے سنا تھا کہ حمیرہ کی ایک جڑواں بہن ہے۔ ہو نہ ہو یہ وہی ہے اور وہی تھی۔ اس

نے یہ بھی سنا تھا کہ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ حمیرہ جہاں تیز ہے، منیرہ حلیم ہے۔ دونوں کی شکل وصورت میں بھی بڑا فرق ہے۔ حمیرہ بڑی خوبصورت ہے اور منیرہ عام شکل و شباہت کی لڑکی ہے۔

سلیم نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا۔ وہ یونیورسٹی کی بغل میں فردوس ریستوران میں چائے پی رہے تھے۔

"اس کو اپنے حسن کا بڑا ناز ہے۔" راشد بولا۔ "اور تعریفوں نے بڑا مغرور بنادیا ہے۔"

"دراصل چند امیرزادوں نے اس کو سر چڑھا رکھا ہے اس لیے نک چڑھی ہوگئی ہے۔" ارشد بولا۔

انل بولا۔ "حسن ایک اضافی چیز ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر دو آنکھیں، دو کان اور ناک ہوتی ہے۔"

"لیکن کسی کسی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے اور اس کا تیرِ نظر کسی کو بھی گھائل کرسکتا ہے۔" ماجد بولا۔ "تم نے وہ نظم نہیں پڑھی جس میں پتنگا شمع پر فدا ہوتا ہے۔ بھونرا پھول پر مرتا ہے اور جگنو ستارہ کی چاہ رکھتا ہے۔"

"یہ انسان کی اپنی اپنی سوچ اور سوچنے کا انداز ہے۔" انل بولا۔

ایک روز حمیرہ سلیم کے پاس آئی۔

"کل آپ نے کلاس اٹینڈ کی؟" حمیرہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"میں کل نہیں آئی تھی۔ مجھے کل کے سبق کا نوٹ چاہئے۔ آپ کے ساتھ نوٹ بک ہوگا؟"

"میں نے سرسری سا لکھا ہے۔ آپ چاہیں تو میں لکھ کر دوں گا۔"

"آپ دیجئے۔ کل تک دے سکتے ہیں۔"

سلیم کا دل جھوم اٹھا۔ جیسے اچانک ایک خزانہ ملا ہو یا کوئی بڑا اعزاز ملا ہو۔

سلیم نے دوسرے روز نوٹ بنا کر دیا اور حمیرہ نے شکریہ ادا کیا۔

"جب بھی میری مدد کی ضرورت ہو، مجھے کہا کیجیے۔" سلیم بولا۔

اس کے دوسرے روز جب وہ کیمپس سے گزر رہا تھا تو حمیرہ ایک لڑکی سے غصہ بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔ "وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ پہلے اپنی اوقات دیکھ لیتا۔"

سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف ہے۔

اس روز پروفیسر نے حقیقت نگاری پر ایک لیکچر دیا اور حسب معمول مثالیں دیں۔ پروفیسر نے ایک انگریز قلم کار پیٹر مورٹمز سے متعلق بتایا کہ اس نے محض تجربے کے لیے انگلینڈ میں ایک دھیلا لیے بغیر تقریباً ایک ماہ کے دوران اپنے کتے کے ہمراہ لگ بھگ آٹھ سو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ اپنے سفرنامہ My Peniless Journey میں اپنے تجربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس دوران کیسے کیسے ٹٹ پونجی لوگوں سے اس کا پالا پڑا۔ کیسے کیسے مسافر اس کی مدد کے لیے آگے آئے اور کیسے کیسے لوگ مصنف کے ساتھ سرد مہری اور رکھائی سے پیش آئے۔

پروفیسر نے بتایا کہ معروف ادیب جارج آرویل نے اپنی کتاب Down and Out in Paris and London لکھنے کے لیے رضا کارانہ طور پر انتہائی غریبی اور بے بسی کی زندگی بسر کی۔ مصنف نے کتاب میں ٹیلی فون ڈائرکٹری کی طرح رین بسیراؤں کی فہرست دی ہے جہاں بے خانماں اور غریب لوگ رات بسیرا کرتے تھے۔

چارلس ڈکنز کی ایک اولاد مونیکا ڈکنز نے ایک خادم کی زندگی سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ایک گھر میں بطور نوکرانی کام کیا۔

جاسوسی اور جرائم پر لکھنے والی امریکی ادیبہ پٹریشیا کورن ویل نے محض مشاہدے اور تجربے کے لیے سرجیکل وارڈ اور مردہ خانہ میں ڈاکٹروں کے ساتھ روزانہ بارہ بارہ گھنٹے گزار دیے۔

پروفیسر نے ایسی کئی مثالیں دیں اور طلبا کو تاکید کی کہ فکشن لکھتے وقت حقائق کا دامن کبھی نہ چھوڑیں۔

گرمیوں کی تعطیلات کے بعد جب سلیم اپنے گاؤں سے لوٹا تو خوش خبری اس کا انتظار کر

رہی تھی کہ وہ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے لیے منتخب ہوا ہے۔ گریجویشن کے بعد اس نے دو مرتبہ سول سروسز کا امتحان دیا تھا لیکن ناکام ہوا تھا اور اب تیسری مرتبہ اس کی محنت اور کوشش بر آئی تھی۔

کچھ مدت کے بعد اس کو ٹریننگ کے لیے بلایا گیا۔ اس اثنا میں وہ منیرہ سے گھل مل گیا تھا۔ منیرہ جانتی تھی کہ سلیم حمیرہ کو بہت چاہتا ہے۔ اس نے بے تکلفی سے منیرہ سے کہا: ''منیرہ، میری محبت تمہاری امانت ہے۔ حمیرہ اور میرے درمیان تم سے بڑھ کر اور کوئی معتبر اور مستند امانت دار نہیں ہو سکتا ہے۔''

''آپ کے بارے میں ابو اور امی سے ہمارے گھر میں کئی دفعہ باتیں ہوئی ہیں۔ آپ مطمئن رہیے۔''

''یہ الفاظ میرے لیے بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ میں یہاں سے پر امید جا رہا ہوں۔''

منیرہ اور سلیم کے درمیان گاہے گاہے فون پر باتیں ہوتی رہیں۔ دو مرتبہ حمیرہ سے بھی باتیں ہوئیں۔

پھر یک لخت سلیم کا فون آنا بند ہوا اور دو مرتبہ سلیم نے منیرہ کا فون نہیں اٹھایا۔ سلیم نے جب مسلسل چار ماہ تک فون نہیں کیا تو منیرہ نے سلیم سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد منیرہ نے فون نہ کرنے پر گلا کیا تو سلیم نے اس کی وجہ مصروفیات اور اپنی کاہلی بتائی۔

منیرہ بولی۔ ''آج مجھے فون کرنے کی ضرورت اس لیے بھی پڑی ہے کہ حمیرہ کو ایک بہت اچھے گھرانے سے پیغام آیا ہے۔ امی کہتی ہیں اگر خدانخواستہ سلیم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے تو اسی کے مطابق فیصلہ لینا ہوگا۔'' منیرہ صاف صاف بولی۔

''میں دو روز بعد آرہا ہوں۔ پھر تفصیل سے باتیں کریں گے۔'' سلیم بولا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ حمیرہ کو اس دوران دو اور اچھے گھرانوں سے پیغامات آئے تھے۔''

''بس دو دن کی بات ہے۔ ہم کہاں ملیں گے؟''

''کہاں ملیں گے؟''

''کیا فردوس ٹھیک رہے گا؟'' سلیم بولا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔''

''شہر پہنچنے پر میں فون کروں گا۔''

''بہتر۔''

وہ فردوس میں ملے۔ اس روز اتوار تھا۔ اس لیے ریستوران میں کوئی طالب علم نظر نہیں آ رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد سلیم اپنے مقصد پر آیا۔

سلیم نے منیرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ جھجکتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

''منیرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

منیرہ مجسم حیرت بن کر چند لمحوں کے لیے سلیم کو دیکھنے لگی۔

''اگر تمہیں قبول ہو تو میں تمہارے ابو اور امی کو پیغام دوں گا۔''

''سلیم، یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' منیرہ بولی۔ ''تم نے حمیرہ سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔ میرے والدین کیا سوچیں گے؟ میں ان کو کیسے اپنا منہ دکھاؤں! کیا آپ نے اس پر سوچا ہے؟''

''حمیرہ کی شادی کسی اچھے گھرانے میں کرادو۔ اگر تم مجھے قبول کرو، تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھوں گا۔''

''سلیم، مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آپ نے میرے لیے ایک بڑا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ آپ میں اچانک یہ بدلاؤ کیسے آیا؟''

''منیرہ، زندگی میں بدلاؤ ایک دفعہ آسکتا ہے، بار بار نہیں آتا۔ میں تم سے 'نا' سننا نہیں چاہتا منیرہ۔''

سلیم نے منیرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کبھی کبھی ہاتھ کا لمس وہ باتیں کہہ دیتا ہے جو زبان نہیں کہہ سکتی۔

(ماہنامہ آجکل، نئی دہلی)

OO

ہوا

پہاڑ کا نصف حصہ چڑھنے کے بعد ہم ایک بڑے پتھر کے سامنے ستانے کے لیے رک گئے۔ پَو پھٹ گئی اور لمحہ بہ لمحہ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔ ہرے بھرے ڈھلوان کھیت، چراگاہیں، پرانے قلعے کا کھنڈر، پہاڑی پر واقع مندر، اسکول کی پرانی شکستہ عمارت جہاں میں نے پانچویں جماعت تک پڑھی تھی، چٹیل میدان، تنگ گلیاں جہاں ہم نے اچھے اور بُرے دن گزارے تھے۔

میری نظر بے ساختہ اپنے مکان پر پڑی جو سفیدہ اور بید کے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ چھت پر گھاس کے گچھے اور گوبر کے اُپلے سکھانے کے لیے قرینے سے رکھے نظر آرہے تھے۔ دودھیل جرسی گائے ناند میں گھاس چر رہی تھی۔ باغیچے کے پاس سبز تلّے پر گھوڑا اگّے سے بندھا تھا۔

میری نظر چھچلتی ہوئی چھوٹے سے آبائی قبرستان پر پڑی جہاں میرے ابا اور اجداد مدفون تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔

'ابا' ہم آج تمہیں چھوڑ کر اس گاؤں سے جا رہے ہیں۔ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے عالم میں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے گاؤں کو الوداع کہا۔

میری بیوی اور بیٹی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کچھ دیر تک ستا کر ہم دوبارہ چڑھنے لگے۔

سونم کے الفاظ ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ڈھائی تین گھنٹہ پہلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر چپکے سے میرے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ سہما سہما سا لگتا تھا اور ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر سرگوشیانہ انداز میں بیٹھا تھا۔

"صدیق تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔"

سہمے سہمے ہم اس کا منہ تاکنے لگے۔

"تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔"

"ابے مذاق نہ کر۔" میں نے اپنے عزیز دوست سونم سے کہا۔

"مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں — ابھی — اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔"

"کیوں؟" میں چلا پڑا۔

"اس کیوں کا اس وقت میرے پاس جواب نہیں ہے صدیق۔" یہ کہتے ہوئے آنسو کا ایک قطرہ اُس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔

میری بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔

"آخر ہم سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟ کون سا ہم نے جرم کیا ہے؟"

"قصور نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا۔ یہ ہوا شہر سے آئی ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا۔"

"مجھے ٹشی نے کہا۔ ٹشی کو دُورجے نے بتایا تھا۔ دُورجے کو چھینگ نے اور چھینگ... ٹشی بتا رہا تھا کہ یہ بات تم کسی کو یہ بات نہ بتاؤ ورنہ یہ لوگ اُس کے مکان کو جلا دیں گے۔"

"یہ لوگ۔"

"ہاں شہر سے آئے ہوئے یہی لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنا مذہب یا گاؤں دونوں میں سے ایک چھوڑ دو۔ صدیق ایسی ہوا انسان لاتا ہے۔"

سونم کا اندازِ بیان بڑا پُراسرار تھا۔ ہم حیران تھے کہ اچانک یہ کیسے ہوا۔ گاؤں والے کل تک ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ہم تین پشتوں سے یہاں آباد ہیں۔ تنگ کرنا تو درکنار، ہر ایک نے ہمیشہ ہمیں پیار و محبت دیا تھا اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوا تھا۔

''مجھے اپنے کانوں میں یقین نہیں آ رہا سونم۔''

''کاش ایسا ہوتا۔''

پھر وہ میری بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بھابی، یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے۔ ابھی نکلنے کی تیاری کرو۔''

چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''پہاڑ سے نکل جاؤ صدیق اور شہر پہنچ جاؤ۔''

''اس اندھیری رات میں کیسے پہاڑ سے جائیں؟''

''راستے سے جانے میں خطرہ ہے۔'' سونم نے اٹھتے ہوئے کہا اور پیچھے غائب ہو گیا۔ وہ ایک چور کی طرح آیا تھا اور چور کی طرح نکل گیا۔

ہم نے بیوی کے زیورات، کچھ کپڑے اور چند ضروری چیزوں کی تین پوٹلیاں بنائیں، کچھ سوکھی روٹیاں اٹھائیں، ناند کو گھاس اور چارے سے بھر دیا۔ گائے اور گھوڑے کو پگّے سے باندھ دیا۔ بھیڑ بکریوں کے لیے باڑے میں گھاس ڈالی اور نالہ پار کر کے پہاڑ کی طرف بڑھے۔ سورج کی زرد کرنیں پہاڑ کی اونچی چوٹی پر لرزنے لگیں اور کچھ وقفے کے بعد ایک پہاڑ کی اوٹ سے سورج نکل آیا۔ چوٹی سے ہم سوڈیڑھ سو قدم نیچے رہ گئے تھے کہ ہم نے دماموں کی آواز سنی اور اُس کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دھیما دھیما شور بھی سنا۔ ہماری ٹانگیں اپنی اپنی جگہ رک گئیں۔ چند ہی لمحوں میں درختوں کی جھنڈ سے لوگوں کی ایک بھیڑ نکلی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے۔ بھیڑ آگے بڑھنے لگی اور نعروں کی آواز آنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے چاروں طرف تیز و تند آندھیاں چل رہی ہیں۔ سونم ٹھیک کہتا تھا کہ ہوا انسان لاتا ہے۔

پانچ دہے پہلے شہر سے ایک ہوا آئی، جس نے اپنے ساتھ چیچک کی متعدی بیماری لائی۔ بیسوں چراغ بجھ گئے، گھر اُجڑ گئے۔ میری دادی اماں، باجی اور چھوٹا بھائی اس کے شکار ہوئے۔

پھر پروا تھی یا بادِ بہار، آزادی کا پیام لائی۔ دل کش جھونکے چلے، تعلیم کا اُجالا پھیلا، بجلی آئی، پینے کا صاف پانی آیا۔

لیکن یہ ہوا بالکل مختلف تھی۔ بادِ صرصر اور بادِ سموم کی طرح۔ گاؤں میں ایسی ہوا کبھی نہیں چلی تھی۔ یہ ہوا اُس ہوا سے بھی موذی اور زہریلی تھی جس نے چھوت کی بیماری لائی۔ اُس ہوا نے انسان کی جانیں لی تھیں، لیکن انسان اور انسان کو جدا نہیں کیا تھا۔

بھیڑ آہستہ آہستہ میرے مکان کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگ اکثر میرے لیے اجنبی تھے۔ بھیڑ میں میں نے اپنے ہمسایہ دورجے کو دیکھا۔

''دورجے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابا، وہ دیکھو— جلوس میں سونم بھی ہے۔'' میری بیٹی چلا پڑی۔

''یہ نہیں ہوسکتا— سونم کبھی نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ دیکھونا ابا— جس نے جھنڈا اٹھایا ہے وہ سونم ہی تو ہے۔''

''سچ مچ، جھنڈا اٹھانے والا سونم تھا۔''

''وہ دیکھو ابا، چچا چھینگ اور ٹشی بھی جلوس میں ہیں۔'' میری بیٹی چلائی۔

''آہستہ بولو فاطمہ۔'' میری بیوی نے سرزنش کی۔

اپنے جگری دوست چھینگ اور ٹشی کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

جلوس مکان کے سامنے رک گیا اور اشتعال انگیز نعرے بلند کرنے لگا جو پہاڑوں سے ٹکرا کر خوف و ہراس کا سماں پیدا کرنے لگا۔ ہر نعرہ کے جواب میں سونم، دورجے، چھینگ اور ٹشی کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے تھے۔

جلوس میں حصہ لینے والے اکثر لوگوں کو غالباً یہ خیال تھا کہ میں اور میرے بیوی بچے مکان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جب مکان سے کوئی نہیں نکلا تو متعدد لوگ مکان میں گھس گئے، ان میں سونم، دورجے، چھینگ اور ٹشی بھی تھے۔

کچھ دیر بعد جب یہ لوگ باہر نکلے تو ان کے ساتھ میرے گھر کا لوٹا ہوا سامان تھا۔ سونم نے گیس سلنڈر اور چولہا اٹھایا تھا۔ ٹشی نے بڑی دیگ اٹھائی تھی، جو گاؤں کے ہر تیوہار اور دعوت پر مجھ سے مستعار لی جاتی تھی۔ دورجے نے بغل میں کوئی چیز دبائی تھی۔ شاید قالین تھا۔ چھینگ نے ناند کے پگّے سے باندھی رسّی تڑائی اور گائے کو ہانک کر لے لیا۔ ایک آدمی نے

گھوڑے کو سنبھالا، دو آدمی بھیڑ بکریوں کو باڑے سے نکال لائے اور ایک طرف لے گئے۔ ایک آدمی تنبو کے بوجھ تلے دبے دبے گزرنے لگا۔ دوسرا بھاری ٹرنک اٹھائے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں آیا۔ میری بیوی اور بیٹی چٹان کی اوٹ میں چھپ کر آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

کیا کل رات سونم نے ہمارے سامنے مگرمچھ کے آنسو بہائے تھے؟

کیا چھینگ، ٹشی اور دورجے نے مجھے گھر سے بے گھر بنانے کے لیے یہ سازش رچی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دنیا کتنی بے وفا ہے اور دوست کیسے طوطا چشم ہیں۔

ابھی میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا کہ مکان کی ایک کھڑکی سے دھواں نکلا اور آن کی آن میں سارا مکان آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میری بیوی چیخ پڑی۔

''خدا کا شکر کرو خدیجہ، ہماری جان محفوظ ہے۔''

پھر بھیڑ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگی اور ہم چٹان کی اوٹ میں سے نکلے اور چھپتے چھپتے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے۔ تھکاوٹ اور بھوک نام کی چیز بالکل ختم ہو گئی تھی۔

دوسرے روز شام کے وقت ہم شہر پہنچے جہاں ہم نے اپنے جیسے کئی اور پناہ گزیں دیکھے۔

ہمارا گاؤں سے بالکل رابطہ ٹوٹ گیا اور کچھ خبر نہیں ملی کہ کھیت کھلیان، باغ اور مویشیوں کا کیا حشر ہوا۔ ایسے میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز میں نے سونم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا — میرے دل میں نفرت اُمڈ آئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔

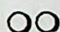
''اب کیا لینے آئے ہو؟' یہ کہہ کر میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''صدیق، مجھے افسوس ہے۔ ہم تمہارا مکان اور سارا سامان بچا نہیں سکے، ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ تمہارے مکان کو آگ نہ لگائیں، لیکن ہماری کوشش بے کار گئی۔ البتہ تمہارا گیس سلنڈر اور چولہا میرے پاس ہے۔ ٹشی کے پاس دیگ ہے۔ دورجے نے قالین بچائے ہیں۔ چھینگ نے تمہاری گائے پال رکھی ہے۔ اس رات ہم چپکے سے تمہارے نیم جلے مکان

دیکھنے گئے۔ کچھ برتن بھانڈے اور اناج کی دو بوریاں بچائیں جو ہم نے حفاظت سے رکھی ہیں۔ یہ سب ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں — ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم گاؤں لوٹ کر آجاؤ۔ ہماری آنگموں اور دورجے کی بیوی ڈولماں کہتی ہیں کہ فاطمہ اور خدیجہ کے بغیر گاؤں سونا سونا لگتا ہے۔

بادِ نسیم تھی یا بادِ صبا، ایک لمبی مدت بعد میں نے ہوا کا ایک دلکش جھونکا محسوس کیا۔

(شمع، نئی دہلی)



صرف ایک کلومیٹر دور ہے

عادل کو ابو اور امی کے الفاظ یاد آئے۔ کینیڈا روانگی سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔ ''تمہارا اتنی دور جانا ہمیں بالکل پسند نہیں ہے۔ تم ہمارے اکلوتے فرزند ہو۔ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو۔ تمہارے بیرون ملک جانے سے ہم بڑے سوگوار ہیں۔ اب جا ہی رہے ہو تو وہاں زیادہ مدت نہیں رہنا۔ ابو اور امی کو نہیں بھولنا۔ ہمیں یاد کرتے رہنا۔ ہاں، کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی نہیں کرنا۔'' امی نے جب یہ بات کہی تو اس کی آنکھوں میں گہری التجا تھی۔

کچھ دیر پہلے الزبتھ نے اس کے گلے کے گرد اپنے مرمریں بازو حائل کر کے کہا تھا:

I love you, Adil.

عادل اس سے قبل پہلی نظر میں الزبتھ کی زلفوں کا اسیر ہوا تھا۔ ان الفاظ نے اس کے من میں آگ سی لگا دی۔ تاہم ابو اور امی کے الفاظ آڑے آئے۔

جب بھی جلوت اور خلوت میں الزبتھ اس کے ذہن پر چھا جاتی تو ابو اور امی کے ملتجیانہ چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔

ایم بی اے کرنے کے بعد وہ اپنے دوست ثاقب کی وساطت سے ٹورنٹو آیا تھا اور ایک کمپنی میں ملازمت ملی تھی۔ اس کمپنی میں الزبتھ بھی کام کرتی تھی۔

روانگی کے وقت اس نے ابو اور امی سے کہا تھا کہ وہ ملک سے باہر کہیں نہیں گیا ہے۔ ایک نیا ملک دیکھنے کا اسے بڑا شوق ہے۔ یہ سنہرا موقع ہے کہ اس کو کینیڈا جیسا ایک خوبصورت اور ترقی یافتہ ملک دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

اس نے وعدہ کیا کہ وہ ٹورنٹو میں ایک سال سے زیادہ نہیں رہے گا۔ وہ ایک سال بھی نہیں رہا اور دس ماہ بعد الزبتھ کو مایوس چھوڑ کر وطن لوٹا۔

کچھ عرصہ بعد اس کو اپنے شہر میں ایک پرائیوٹ کمپنی میں کام ملا۔ ابو اور امی کی خواہش تھی کہ جیتے جی اس کی شادی کرائیں۔

ابو اپنی بھانجی سے اس کی شادی کرانا چاہتے تھے۔ امی کو بھی یہ لڑکی پسند تھی لیکن عادل ایک اور لڑکی کو دل دے بیٹھا۔

ابو نے کہا۔ "ہم تمہاری پسند کی لڑکی سے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں۔ اس کے خاندان کا کوئی علم نہیں ہے جبکہ نعیمہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ صورت اور سیرت سے نعیمہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"سلمیٰ بھی اچھی لڑکی ہے ابو۔"

ابو اور امی نے عادل کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

ابو بولا۔ "تمہاری پسند ہماری پسند ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تم ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

یہاں عادل نے پہلی دفعہ انکشاف کیا کہ کینیڈا میں ایک مغربی لڑکی الزبتھ کو وہ بہت چاہتا تھا اور لڑکی کو بھی اس سے بڑا پیار تھا۔ لیکن ابو اور امی کی محبت اس کے لیے زیادہ اہم تھی اور وہ بھاری دل سے لڑکی کو چھوڑ کر حسب وعدہ ایک سال کے اندر گھر لوٹا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ابو اور امی کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔

سلمیٰ سے عادل کی شادی ہوئی۔ چند ماہ اچھی طرح سے گزرے۔ ابو اور امی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ سلمیٰ کے رویے میں بدلاؤ آیا۔ وہ بار بار میکہ جانے لگی۔ یا اپنی کسی سہیلی کے ساتھ کسی بہانے گھر سے نکلتی تھی اور دیر سے لوٹتی تھی اور خانہ داری کا سارا بوجھ امی پر پڑتا تھا۔

گھر کا ماحول اس کو راس نہیں آتا تھا۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی بات پر شکوہ شکایت کرنے لگی۔

ایک روز عادل بولا۔ "ابو، میں ایک فلیٹ خرید رہا ہوں۔"

"کس لیے؟" ابو نے پوچھا۔

''رہائش کے لیے۔''

''رہائش کے لیے اپنا مکان ہے۔''

''فلیٹ میں اپنی کشش ہے۔''

ابو اور امی کو محسوس ہوا کہ یہ عادل نہیں کہہ رہا ہے بلکہ سلمٰی کہہ رہی ہے۔ امی کو ایک ہمسائی نے بتایا تھا کہ بہو ماں باپ سے الگ رہنا چاہتی ہے۔ ہمسائی نے سلمٰی کی ایک سہیلی سے یہ بات سنی تھی۔ تب امی کو ہمسائی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

''اپنے گھر میں کیا کمی ہے عادل؟'' ابو نے کہا۔

''دو بیڈ والا یہ فلیٹ شہر کے مضافات میں ایک کھلی جگہ واقع ہے۔ ابو، یہاں سے یہ صرف ایک کلومیٹر دور ہے۔ گرد و نواح کا منظر بڑا دلکش ہے۔ دور دور تک ہریالے کھیت نظر آتے ہیں۔''

''آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔'' عادل بولا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ ابو اور امی اپنا مکان چھوڑ کر فلیٹ میں نہیں جائیں گے۔

''ہم اپنا یہ مکان چھوڑ کر ایک فلیٹ میں کبھی نہیں جائیں گے۔'' امی بولیں۔

''امی، ہمارا محلّہ بڑا گنجان ہو گیا ہے۔''

''یہ ہمارا آبائی مکان ہے۔'' ابو بولے۔ ''ہم برسوں سے اس میں رہ رہے ہیں۔ اس سے گہرا انس ہے۔ بہت ساری ناقابل فراموش یادیں اسے وابستہ ہیں۔ ہمسائے اچھے ہیں۔ کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ دو بیڈ کے ایک فلیٹ میں ایک خاندان کا گزارہ کیسے ہوگا۔ مہمان آتے ہیں۔ زندگی میں دکھ سکھ آتے ہیں۔ جگہ بڑی ہونی چاہیے۔''

''عادل بیٹا، دراصل بہو ہم سے الگ ہونا چاہتی ہے۔'' امی بولیں۔

''نہیں امی، یہ بات صحیح نہیں ہے۔''

''یہ بات صحیح ہے عادل۔ امی نے یہ بات کسی سے سنی ہے۔ پہلے ہمیں یقین نہیں آیا۔ فلیٹ کا دام کیا ہے بیٹا؟'' ابو نے پوچھا۔

عادل نے دام کا انکشاف نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا کہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم اور

سلمیٰ کے باپ کی جزوی مدد سے فلیٹ کی قیمت چکائی جاسکتی ہے۔

''کس منزل پر ہے؟ تم نے یہ بات بتائی نہیں۔'' ابو بولے۔

''چوتھی منزل پر ہے۔''

''کیا لفٹ ہے؟''

''فی الحال لفٹ نہیں لگی ہے۔''

''عادل، اس عمر میں چوتھی منزل پر آنا کیا امی اور میرے لیے مشکل نہیں ہے؟ تم جانتے ہو۔ ماں کو دل کا عارضہ ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے سے سانس پھولتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے۔''

عادل نے اس کا جواب نہیں دیا اور باہر چلا گیا۔

''عادل کتنا سیدھا سادہ ہے؟'' امی بولیں۔ ''بہو کی باتوں میں فوراً آجاتا ہے۔

''سلمیٰ نے اس کو شیشے میں اتارا ہے۔'' ابو بولے۔

''ابو اور امی نے عادل کی مرضی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ عادل نے فلیٹ خرید لیا اور وہ اور سلمیٰ اس میں منتقل ہوئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد سلمیٰ ایک پرائیویٹ اسکول میں بطور استانی کام کرنے لگی۔

عادل ایک روز گھر آیا اور کہا۔ ''میں کمپنی کے کام پر ایک ماہ کے لیے بمبئی جا رہا ہوں۔ سلمیٰ اکیلی ہے۔ امی ایک ماہ کے لیے سلمیٰ کے ساتھ رہیں۔''

''ابو اکیلے رہ جائیں گے۔ میں نہیں جاسکتی ہوں۔'' امی بولیں۔

''سلمیٰ کو ایک ماہ کے لیے یہاں لاؤ۔'' ابو بولے۔

''وہ یہاں نہیں آئے گی۔ میں نے اس کو کہا تھا۔''

''ابو کو چھوڑ کر میں کیسے جاسکتی ہوں۔'' امی بولیں۔

''امی کی صحت بھی اچھی نہیں ہے عادل۔'' ابو بولے۔

''امی، سلمیٰ حاملہ ہے۔ امی کو باہر نہیں جانا ہے۔ سلمیٰ اسکول سے لوٹتے ہوئے ضروریات کی اشیا لے آئے گی۔ صبح ایک عورت صفائی کرنے اور برتن مانجھنے آتی ہے۔ امی، آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہاں ابو کو کون کھانا بنائے گا؟"

عادل بے بسی اور بے چارگی سے ابو اور امی کو دیکھنے لگا۔ اس کا افسردہ اور مایوس چہرہ دیکھ کر ابو اور امی کا دل پسیجا اور امی جانے کے لیے تیار ہوئیں۔

عادل کی روانگی کے دوسرے روز سلمیٰ بولی۔ "امی، آپ کو عادل نے خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ میں اکیلی رہ سکتی ہوں۔"

"عادل نے مجھے اصرار کیا بہو، تمہارا تنہا رہنا اس کو اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"فلیٹ بالکل محفوظ ہے۔ اس لیے مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی ہے۔"

سلمیٰ ناشتہ کرنے کے بعد اسکول جاتی تھی۔ کئی دفعہ لنچ کے لیے گھر میں کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ جب امی نے سلمیٰ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے برا مانا۔

سلمیٰ کا موڈ بھی خراب رہتا تھا۔

ایک ہفتہ بعد امی گھر لوٹ آئیں۔ دوسرے روز بمبئی سے عادل کا فون آیا۔

"ابو، امی سلمیٰ کو اکیلی چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔"

"بیٹا، سلمیٰ نے کہا ہے کہ وہ اکیلی رہ سکتی ہے۔"

"نہیں ابو، یہ غلط ہے۔ امی کا جانا سلمیٰ کو اچھا نہیں لگا ہے۔"

"سلمیٰ کو بات بات پر غصہ آتا تھا اور ایسی صورتِ حال پیدا کی تھی کہ امی کا وہاں رہنا مشکل ہوا اور مجبوراً گھر لوٹی۔ امی سے بات کرو۔"

"امی نے فون لیا اور بولیں۔ "فون پر کیا بتاؤں عادل۔ گھر جب لوٹو تو بتاؤں گی۔"

عادل نے فون رکھ دیا۔

"عادل کتنا بھولا بالا ہے۔" امی بولی۔ "سلمیٰ کے مزاج کو ابھی تک سمجھ نہیں سکا ہے۔"

امی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ عادل کا الگ رہنا ان کو بہت بھاری لگتا تھا۔ اس لیے وہ مغموم رہتی تھیں۔

ایک روز امی کی چھاتی میں درد ہوا اور ہسپتال میں داخل کیا۔ امی نے عادل کو بلانے کے لیے کہا لیکن اس کا فون بند تھا۔ سلمیٰ کو فون کیا اور عادل کو جلدی اطلاع دینے کے لیے تاکید کی۔

امی کو دل کا ہلکا سا دورہ پڑا اور بے ہوش ہو گئیں۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد دوبارہ سخت دورہ پڑا اور دل کی حرکت بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوا۔

عادل نماز جنازہ پر قبرستان پہنچا۔

اب ابو اکیلے گھر پر تھے۔ ابو نے کھانا پکانے اور گھریلو کام کاج کرنے کے لیے ایک آدمی رکھا۔ کبھی کبھی عادل گھر پر آتا تھا اور کچھ وقت گزار کر جاتا تھا لیکن ابو کبھی عادل کے فلیٹ پر نہیں گئے۔

ایک روز ابو بیمار پڑے۔ ہمسایہ کا لڑکا طارق ایک ڈاکٹر لے آیا۔ ڈاکٹر نے جانچ کی۔ نام پوچھا اور نسخہ لکھا۔

ڈاکٹر بولا۔ ''جسمانی طور پر آپ ٹھیک ہیں۔ البتہ ذہنی تناؤ کے شکار لگتے ہیں۔ تنہائی سے تناؤ پیدا ہوا ہے اور ذہن میں نت نئے خیالات آتے ہیں۔ آپ مصروف رہا کریں اور ذہنی تناؤ کو پھٹکنے نہ دیں۔''

''بہتر ڈاکٹر۔'' ابو بولے۔

''مسٹر سلیمان! کیا آپ اکیلے ہیں؟ اولاد، بیوی نہیں؟''

''بیوی دس ماہ پہلے چل بسیں ڈاکٹر صاحب۔ ایک بیٹا ہے وہ کینیڈا گیا تھا جہاں پہلے ایک گوری لڑکی پر فریفتہ ہوا تھا۔ پھر...''

''سلیمان صاحب!'' ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شہر میں مَیں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں۔ جن کی اولاد کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں ہیں۔ وہ وہاں حصولِ تعلیم اور معاش کی تلاش میں گئے تھے جہاں کسی سفید فام لڑکی سے شادی کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے ماں باپ ان کی غیر موجودگی میں کسمپرسی کے عالم میں یہاں فوت ہوئے۔ آپ اکیلے نہیں ہیں سلیمان صاحب...''

''ڈاکٹر صاحب! میرا اکلوتا بیٹا کینیڈا میں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے صرف ایک کلومیٹر دور رہتا ہے اور اس کی بیوی کوئی سفید فام عورت نہیں ہے بلکہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے۔''

(ثبات، مونگیر بہار)

OO

اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد

میں پبلک پارک میں ایک سنگی بینچ پر بیٹھا تھا۔ لمبے لمبے بالوں اور چھدری چھدری داڑھی والا ایک وحشت زدہ سا آدمی میرے پاس آکر کھڑا ہوا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کو تاکنے لگا۔

''مابدولت اکبراعظم ہوں۔'' وہ بولا۔

''گول گلاب والا اکبر آدم؟'' میں نے پوچھا۔

''آدم نہیں۔ اعظم، اکبراعظم! شہنشاہِ ہندوستان۔ مغلیہ حکومت کا تاجدار۔'' سنگی بینچ کے دوسرے کونے پر بیٹھتا ہوا وہ بولا۔

''میرے مولا! کس مجنون سے پالا پڑا۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''تم اکبر تو نہیں لگتے۔''

''تم نے مابدولت کو تم کہا۔ شہنشاہ ہندوستان کو تم کہا۔ جلاد!'' اونچی آواز میں وہ چلایا۔

''جہاں پناہ، آپ کے چہرے پر اکبر برانڈ مونچھ نظر نہیں آتی۔''

وہ یک لخت شانت پڑ گیا اور بولا۔ ''ایک ناتجربہ کار نائی نے غلطی سے مابدولت کی مونچھ کاٹ لی اور مابدولت نے کسی غلطی کے بغیر اُس کو کاٹ دیا۔''

''میں نہیں سمجھا عالم پناہ۔''

''اس نابکار نائی کا سرتن سے جدا کرا دیا۔''

''ظلِ سبحانی! آپ کے ساتھ کوئی محافظ نہیں۔ کوئی نورتن نظر نہیں آتا۔''

''احمق! مغل تاجدار نورتن ساتھ لیے نہیں پھرتے ہیں۔ راجا ٹوڈرمل اور عبدالرحیم خانخاناں شاہی دربار میں ہیں۔ ابوالفضل آئین اکبری کی نظرثانی کررہا ہے۔ مان سنگھ اور راجا بھگوان داس دکن کی مہم پر روانہ ہوئے ہیں۔''

''بادشاہ سلامت، اب وہ دکن نہیں رہا ہے...''

''خاموش! مابدولت کو پورا بولنے دو۔'' اس نے میرا جملہ کاٹ لیا۔

''بیربل اور ملا دو پیازہ کہیں نوک جھونک کررہے ہوں گے۔ تان سین کسی ساز سنگیت پر ریاضت کررہا ہوگا۔''

''اور شہنشاہ ہندوستان اکیلے گھوم رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''خاموش! بیچ میں نہیں بولو۔ مابدولت کے لیے بگھی کا انتظام کرو۔ مجھے فتح پور سیکری جانا ہے۔''

''مغل اعظم، بگھی اور بیل گاڑی کا زمانہ ختم ہوا ہے۔ یہ ہوائی جہاز، کار اور ریل گاڑی کا زمانہ ہے۔ مغل اعظم، آپ حکم دیں تو ایئر انڈیا سے ابھی آپ کا رابطہ قائم کرتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔

''جہاں پناہ، بادشاہت ختم ہوئی ہے اور جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ لوگوں کے نمائندے حکومت چلاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو فتح پور سیکری یا آگرہ کے کسی حلقہ انتخاب سے چناؤ لڑ سکتے ہیں۔ آگرہ میں آپ کے پوتے شاہجہان کا تعمیر کیا ہوا تاج محل ہے جسے دیکھنے دنیا بھر سے سیلانی آتے ہیں۔''

''مابدولت کو ایسی فضول، بے ہودہ، غلط، واہیات اور بے بنیاد باتیں سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''جان کی امان پاؤں تو ایک سوال کروں؟''

''اجازت ہے۔''

''جہاں پناہ۔ آپ نے انارکلی کو زندہ دیوار میں چن دیا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اور ولی عہد جہانگیر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔''

''نورالدین نے خاندان چغتائی کے نام پر داغ لگایا۔''

''شہنشاہ اعظم! گستاخی معاف، حضور نے یوسف شاہ چک کی حکومت چھین لی اور حبہ خاتون کو اپنے محبوب سے جدا کر دیا۔''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

''میں نے جماعت دہم تک تاریخ پڑھی ہے عالم پناہ۔''

''جہاں پناہ، آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''گستاخ! تم نے دوبارہ ایسا سوال پوچھا تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا۔ جونائی کے ساتھ کیا گیا ہے۔''

''ظل رحمانی، میں معافی چاہتا ہوں اور آپ کو اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں جس نے آپ پر تحقیقی کام کیا ہے اور اپنی پی ایچ ڈی ڈگری کے لیے تھیس لکھا ہے۔''

''پی ایچ ڈی اور تھیس کیا بلا ہیں؟''

''آپ پر مقالہ لکھا ہے، کتاب لکھی ہے۔''

''مابدولت کو دعوت منظور ہے۔''

''وہ پاس ہی رہتا ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ چلا۔

''یہ شاہی محلات کن کے ہیں؟''

''یہ شاہی محلات نہیں عالم پناہ، یہاں امرا، رؤسا اور بیروکریٹ رہائش پذیر ہیں۔''

''بیوروکریٹ؟'' تم نے پھر فرنگی زبان بولی۔ ''جہاں پناہ، یہ منصب داروں، وزیروں، عاملوں اور عمائدین شہر کی رہائش گاہیں ہیں۔''

''یہ تو بڑے عالی شان ہیں۔''

''ان کے پاس اور بھی محلات ہیں ظل سبحانی۔ دھن دولت، روپیہ پیسہ۔''

''ان کو فی الفور سرکار کی تحویل میں لاؤ۔ تجوریوں کو توڑ دو، جن میں روپیہ رکھا ہے۔''

''عالم پناہ، کالا دھن ہاتھ میں آنا بہت مشکل ہے۔''

''اور وہ چھوٹے چھوٹے مکانات؟''

''وہ غریبوں کی بستی ہے شہنشاہ ہند۔ میرے دوست کا مکان بھی وہیں ہے۔''

''کیا تمہارا دوست منصب دار نہیں ہے؟''

''نہیں۔ جہاں پناہ!'' وہ خاموشی سے چلتا رہا۔

''ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں عالم پناہ۔'' میں نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ثاقب برآمدے پر ایک کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

''ہوشیار! خبردار! شہنشاہ ہندوستان مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر تشریف لا رہے ہیں۔''

''یہ کس جانور کو اپنے ساتھ لائے ہو؟'' ثاقب بولا۔

''آہستہ بولو۔ سن لیا تو بپھر جائے گا۔'' اور قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ''آپ مغل بادشاہ اکبر اعظم ہیں۔''

''مابدولت اکبر اعظم ہیں۔ چغتائی خاندان کا چشم و چراغ۔ چنگیز خان کی اولاد۔ ہندوستان کے تاجدار۔ ہم نے سنا کہ تم نے ہمارے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ مابدولت تمہیں آفرین کہنے آئے ہیں۔''

''تم 17 اکتوبر 1605 کو مر گئے تھے۔ تمہیں تو آگرہ کے پاس سکندریہ میں منوں مٹی کے نیچے ہونا چاہیے۔''

''جلاد! اس گستاخ کا سر قلم کردو۔ اس کی زبان تالو سے کھینچ لو۔'' وہ چلایا۔

''اکبر اعظم نے 19 سال کی عمر میں تلوار کے ایک ہی وار سے ایک شیر کو مار دیا تھا۔ تم جیسا ایک مریل آدمی ایک مچھر کو مار نہیں سکتا۔ شیر کی دہاڑ سن کر گر جاؤ گے۔''

''نابکار! تب میں عنفوان شباب میں تھا۔''

ثاقب کو ہنسی آئی اور اس کو اپنی کرسی پیش کی۔

''اکبر، جودھا بائی کی یاد نہیں آتی؟''

''کون جودھا بائی؟''

''ملکہ ہندوستان۔ آپ کی رفیقہ حیات۔ امبر کے راجا بہاری مل کی خوبصورت بیٹی۔ جس کا بھائی راجا بھگوان داس اور بھتیجا آپ کے مشہور جرنیل تھے۔ اپنی بیوی کو بھول گئے۔''

''جلاد! اس گستاخ آدمی کا سرتن سے جدا کرو۔ اس کی آنکھیں پپوٹوں سے نکال باہر کرو۔''

ظل سبحانی! ظل رحمانی، آپ نے ایک مرتبہ حکم دیا تھا کہ جب تک حضور تین مرتبہ نہ بولے۔ کسی کو موت کی سزا نہ دی جائے۔ ابھی آپ دو مرتبہ بول چکے ہیں۔ خاکسار آپ سے معافی کا طلب گار ہے۔''

''یہ بڑے بڑے کاغذ پر کیا پڑھ رہا ہے؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''یہ اخبار ہے بادشاہ سلامت۔ اس میں روز روز کی خبریں چھپتی ہیں۔''

''آج کی کیا خبریں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''عالم پناہ، زیادہ خبریں گھوٹالوں کی ہیں۔'' ثاقب بولا۔

''گھوٹالوں؟''

''جہاں پناہ، اس کا مطلب ہے خرد برد، غبن، بدعنوانی اور رشوت ستانی۔'' میں نے وضاحت کی۔

ثاقب بولا۔ ''بجلی کی رقم میں خرد برد، پانی کی رقم میں غبن، سڑک کی رقم میں ہیر پھیر، سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ، ملازموں کی بھرتی میں بدعنوانی۔''

''مرحبا، مرحبا! یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اس میں خرد برد کی باتیں چھپتی ہیں۔ لوگوں کو ان کا علم ہو جاتا ہے۔''

''عالم پناہ!'' ثاقب بولا۔ ''خبریں تو روز چھپتی ہیں لیکن ہم نے کسی کو سزا پاتے نہیں دیکھا ہے۔ اگر کبھی کوئی سزا پاتا ہے تو وہ چھوٹا سا غریب ملازم ہوتا ہے اور چھوٹی سی رقم ہوتی ہے۔ جو لاکھوں کروڑوں روپے ہڑپ کرتے ہیں، وہ ڈکار تک نہیں لیتے بادشاہ سلامت۔''

''سزا کیوں نہیں لگتی ہے؟''

''جہاں پناہ! قانون میں ایسی پیچیدگیاں رکھی ہیں اور ملزم ایسے طور طریقے اختیار کرتے ہیں کہ ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔''

''مرتشی کو عمال کیوں بنایا جاتا ہے؟''

''مغل اعظم، یہ تو سب کو پتہ ہوتا ہے کہ کون عامل مرتشی ہے۔ کون دیانت دار ہے اور کون بدعنوان ہے۔ لیکن سب کچھ چلتا ہے۔''

''محتسب محاسبہ نہیں کرتے؟ احتساب نہیں کرتے؟''

''کئی دفعہ محتسب خود بندر بانٹ میں شریک ہوتے ہیں حضور۔''

''حیف صد حیف، قاضی کے پاس معاملہ کیوں نہیں لے جاتے؟''

''ظل سبحانی، قاضیوں کے پاس تین کروڑ مقدمات پڑے ہیں جن میں ہر سال پانچ لاکھ مقدمات کا اضافہ ہوتا ہے۔ پانچ پانچ، دس دس اور پندرہ پندرہ سال کے مقدمات پڑے ہیں۔ گواہان مر جاتے ہیں۔ ظالم سینہ تان کر گھومتے ہیں اور مظلوم کو انصاف نہیں ملتا۔''

''قاضی القضاۃ کے پاس لے جاؤ۔''

''قاضی القضاۃ کے پاس لاکھوں مقدمات پڑے ہیں۔''

''تُف! تُف! مفتی کچھ نہیں کرتے؟''

''ظل رحمانی، اس اخبار میں ایک لڑکی کا خط چھپا ہے۔ اگر ظل رحمانی اجازت دیں تو میں اس خط کو پڑھ کر سناؤں گا۔'' ثاقب بولا۔

''اجازت ہے۔''

لڑکی لکھتی ہے:

''میں دس سال سے ایک گاؤں میں کام کر رہی ہوں۔ اسکول آنے جانے کے لیے روزانہ گاڑی میں 80 کلومیٹر اور پیدل دو کلومیٹر سفر کرتی ہوں۔ بارسوخ عورتیں دس دس پندرہ پندرہ سالوں سے شہر میں اپنے گھروں کے سامنے کام کر رہی ہیں۔ بہتوں کو ان کی سہولت اور آسائش کے لیے منسلک رکھا گیا ہے۔''

''شہنشاہ اعظم یہ محکمہ تعلیم تک محدود نہیں ہے۔ محکمہ صحت اور دوسرے محکموں میں بھی یہی حالت ہے۔''

''یہ عورتیں کون ہیں؟''

''یہ وزیروں، عوامی نمائندوں، سیاسی لیڈروں، رشوت دینے والوں، اثرورسوخ رکھنے والوں اور عمال کی بیگمات اور بہو بیٹیاں ہیں، عالم پناہ۔''

''کوئی نوشیروانِ عادل نہیں ہے؟''

''نہیں جہاں پناہ۔ عدل جہانگیری بھی نہیں۔''

''نفرین! نفرین!''

''ظل سبحانی کو مناظرے کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس موضوع پر ایک مناظرہ کرائیے۔''

وہ قہقہہ زن ہوا اور بولا۔ ''اچھا مشورہ ہے۔''

اور اخبار میں چھپی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

''یہ تصویر کیا کہتی ہے؟''

''یہ یومیہ اُجرت پانے والے ہیں حضور۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''یہ یومیہ پچاس روپے کی اجرت میں اضافہ چاہتے ہیں، مغل اعظم۔''

''پھر؟''

''اور یومیہ ڈھائی ہزار روپے سے زیادہ مشاہرہ لینے والے ارباب اختیار نہیں دے رہے ہیں۔''

''اور یہ تصویر؟''

''یہ بے روزگار نوجوانوں کا جلوس ہے عالم پناہ۔ روزگار مانگ رہے ہیں۔''

''تخلیہ، تخلیہ!'' یہ کہتا ہوا وہ اچانک کھڑا ہوا اور چلا گیا۔

''جہاں پناہ۔ کچھ دیر رُک جائیے۔'' ثاقب چلایا۔ ''ہم آپ کو کوہ میران کی سیر کراتے ہیں۔ جہاں آپ کا تعمیر کیا ہوا قلعہ ہے۔ کم سے کم فلم مغل اعظم یا انارکلی تو دیکھتے جائیے۔''

اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور گلی کے موڑ پر غائب ہوا۔

صبح میں ابھی بستر میں ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

ثاقب کا فون تھا۔

''صبح صبح کیسے یاد کیا؟ خیریت تو ہے؟''

''اخبار پڑھا؟''

''نہیں تو۔''

''ایک خبر ہے: مفرور پاگل تین گھنٹے بعد واپس پاگل خانہ لوٹا۔

آگے لکھا ہے: اس نے نفسیاتی معالج سے کہا۔ میں بڑے پاگل خانے سے چھوٹے پاگل خانے میں واپس آیا ہوں۔''

(کشمیر عظمیٰ)

OO

مظلوم

جب اجمل صاحب حقوقِ نسواں کی سالانہ تقریب میں اپنی حسین بیوی غزالہ کے بغیر آئے تو سب کو حیرت ہوئی۔ وہ غیر متوقع طور پر ٹرین سے آئے تھے اور ایک ٹیکسی میں اچانک اکیلے جلسہ گاہ تک پہنچے۔ ہر سال وہ ایک لمبی سفید کار میں آتے تھے اور انجمن کے اراکین قصبے سے باہر ان کی پیشوائی کرتے تھے۔ اجمل صاحب نے پانچ سال پہلے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی اور وہ ہر سال غزالہ کے ہمراہ بلا ناغہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے آتے تھے۔

ان کی اہلیہ غزالہ انجمن کی روح رواں تھیں۔ ان کی طرح دار اور دلکش شخصیت انجمن کی تقریب کو چار چاند لگاتی تھی لیکن اس دفعہ ڈائس پر غزالہ کی غیر حاضری سے تقریب کا گلیمر ختم ہو گیا تھا۔

اجمل صاحب نے عورتوں کی بہبودی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اور ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

اجمل صاحب بڑے حساس انسان تھے اور ان کی حساس اور بے چین طبیعت نے ہی ان کو سماجی میدان میں لا کھڑا کیا تھا۔ ایک مرتبہ قصبے میں ایک نو بیاہی لڑکی کی پُر اسرار موت ہوئی۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ لڑکی کو سسرال والوں نے محض جہیز کے لالچ کی وجہ سے مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا تھا۔ تاہم اسے خودکشی کی واردات قرار دے کر معاملے کو رفع دفع کر دیا گیا تھا۔ اس سانحہ کا اجمل صاحب کے ذہن پر ایسا اثر ہوا کہ وہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے میدان میں کود پڑے۔

جب وہ کم سن تھے، ان کے پڑوس میں ایک دھوبی دھوبن کو روز مارتا تھا۔ دھوبن کی چیخوں سے ان کا ننھا سا دل دہل جاتا تھا۔ اجمل صاحب اپنی کوٹھی کے دریچے سے نیچے چال میں رہنے والی دھوبن کو بے بسی سے پٹتے اور چیختے ہوئے دیکھتے تھے اور ان کا دل اس منظر سے کڑھتا تھا۔ ایک روز دھوبن چل بسی اور اجمل صاحب نے روز روز کی چیخوں سے نجات پائی، لیکن ان کے لاشعور سے یہ چیخیں کبھی نہیں گئیں، بارہ سال بعد جب دھوبی کا لڑکا اپنی نو بیاہتا بیوی کو پیٹنے لگا تو پھر وہی چیخیں ان کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ اب کڑیل جوان تھے۔ انہوں نے دریچے سے دھوبی کے لڑکے کو ٹوکا کہ وہ اپنی بیوی پر ہاتھ نہ اٹھائے لیکن دھوبی کے لڑکے نے جب دوبارہ اپنی بیوی کو زدوکوب کیا تو اجمل صاحب بھنائے ہوئے سیدھے چال میں گئے اور دھوبی کے بیٹے کی ایسی مرمت کی کہ اس نے دوبارہ پھر کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

سماجی میدان میں آنے کے بعد اجمل صاحب کو گندی بستیاں اور گنجان آباد محلوں کو دیکھنے کا موقع ملا اور کئی ایسی دردناک اور دل دوز باتیں اُن کے مشاہدے میں آئیں جن کا انہیں خواب وخیال بھی نہ تھا۔ کتنی ساری جوان لڑکیاں محض جہیز کی وجہ سے شادی کے بغیر گھروں میں پڑی تھیں۔ بہت ساری نئی نویلی دلہن کا خواب دیکھتے ہوئے اپنی جوانی کی منزل پھلانگ چکی تھیں، کتنے سارے لوگ اپنی کمائی بھنگ اور ٹھرّے میں اڑا دیتے تھے اور گھر میں فاقہ کشی منڈلاتی تھی۔ اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھانا تو معمولی بات تھی اجمل صاحب سب کی مدد کرتے تھے۔ انہوں نے کئی لڑکیوں کی شادی کرائی اور کئی مطلقہ عورتوں کو دوبارہ زندگی دی۔ یہ ان کا سماجی مرتبہ اور شخصیت کا دبدبہ تھا کہ کئی اکھڑ مرد راہِ راست پر آگئے اور اپنی بیویوں سے اچھا برتاؤ کرنے لگے۔ وہ طبقہ نسواں میں بڑے مقبول تھے اور اکثر کہا کرتے تھے۔ ''عورت سدا سے مظلوم ہے اور مرد ہمیشہ سے ظالم۔ ہم ایسے سماج کی پیداوار ہیں جن پر مردوں کا غلبہ ہے۔''

اپنی سماجی سرگرمیوں کے دوران ہی اجمل صاحب کی ملاقات غزالہ سے ہوئی تھی۔ غزالہ حسین، ذہین اور تعلیم یافتہ تھیں اور اجمل صاحب کی طرح وہ بھی حقوق نسواں کی علمبردار تھیں۔

دو تین ملاقاتوں کے بعد وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ انہوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی سماجی خدمت میں جٹ گئے۔ انہوں نے انجمن حقوق نسواں کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس میں ہر فرقے کے ممبر تھے۔ غزالہ کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے انجمن میں گلیمر آیا اور اجمل صاحب کی سماجی معلومات کی ڈکشنری میں نئے الفاظ کا اضافہ ہونے لگا۔ بہت ساری عورتیں اجمل صاحب کے سامنے اپنے نجی مسائل بتانے سے ہچکچاتی تھیں لیکن ہم صنف ہونے کے باعث غزالہ کے سامنے وہ بے کم و کاست ان کا ذکر کرتی تھیں۔ ان کی کوٹھی ایک سماجی ادارہ بن گئی تھی جہاں صبح و شام مصیبت زدہ عورتیں اپنی بپتا لے کر آتی تھیں۔ دونوں میاں بیوی اپنی بساط بھر ان کی مدد کرتے تھے۔

الیکشن کا موسم آتا تو امیدوار اجمل صاحب کی کوٹھی کے چکر کاٹتے اور ان سے خاص طور پر عورتوں کے ووٹ کے لیے اپیل کرتے تھے۔ اجمل صاحب کہتے کہ ان کی انجمن اس اُمیدوار یا پارٹی کی حمایت کرے گی جو عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرے گی اور ان کے حقوق کے لیے لڑے گی۔ اس طرح انجمن حقوقِ نسواں کو علاقے کے سرکردہ سیاست دانوں کی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔

شادی کے دو سال بعد وہ قصبے سے منتقل ہوئے جہاں ان کی آبائی جائداد تھی۔ شہر میں انہوں نے ایک ذیلی انجمن قائم کی اور دونوں اس کے کرتا دھرتا بن گئے تاہم انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے وہ غزالہ کے ساتھ قصبے میں آتے رہتے اور گاہے گاہے وہ انجمن کے لیے معقول رقم نذر کرتے رہتے تھے۔ اس موقع پر وہ اور غزالہ قصبے میں کئی روز قیام کرتے اور لوگوں سے ملتے تھے۔

لیکن اس دفعہ غزالہ کے بغیر تقریب سونی سونی لگ رہی تھی۔ خاص طور پر انجمن کے اراکین کو غزالہ کی غیر حاضری بری طرح کھٹک رہی تھی۔ تاہم اجمل صاحب سے غزالہ کے بارے میں کسی کو پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔

تقریب کی افتتاح کے تھوڑی دیر بعد اجمل صاحب معذرت کے چند الفاظ کہہ کر جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ انجمن کے کئی اراکین ان کو رخصت کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن

آنے کے لیے مصر تھے لیکن انہوں نے منع کیا۔ وہ اپنے ایک بے تکلف دوست نعیم کی کار میں ریلوے اسٹیشن گئے۔

''اجمل، بھابی کیوں نہیں آئیں؟'' نعیم کا پہلا سوال یہی تھا۔

''غزالہ مجھ سے الگ ہوگئی ہے۔'' اجمل صاحب نے کرب ناک آواز میں کہا۔

''الگ ہوگئیں؟ کب؟'' نعیم کے لیے یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔

''کئی ماہ ہوئے۔'' اجمل صاحب کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔

''اور تم نے ہم سے اب تک چھپائے رکھا۔ آخر کیسے؟ کیا تم نے طلاق دی؟''

''وہ مجھ کو چھوڑ کر چلی گئی اور مجھ سے طلاق مانگ لی۔'' اجمل صاحب کے لہجے میں گہرا کرب چھپا ہوا تھا۔

''وہ کہاں ہے آج کل؟''

''اس نے دوسری شادی کی ہے۔''

اجمل صاحب کے چہرے پر ایک اور رنگ آیا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر نعیم کو اور سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ گم صم گاڑی چلانے لگا۔

''نعیم!'' اجمل صاحب نے کئی منٹ کے بعد سکوت توڑا اور دھیمی آواز میں رُک رُک کر کہنے لگے۔ ''غزالہ کی ایک بڑی کمزوری خوبصورتی ہے۔ وہ ہمیشہ اسمارٹ اور وجیہہ مردوں کی باتیں کرتی رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

نعیم نے گاڑی ایک طرف کھڑی کردی اور اجمل صاحب سے پوچھا۔ ''اجمل تم دوسری شادی کیوں نہیں کرتے؟ اپنی پسند کی کوئی لڑکی دیکھ لو۔''

''ایک مرد کے لیے دوسری شادی کرنا آسان نہیں ہے، نعیم۔ ایک مطلقہ عورت کی طرح ایک طلاق شدہ مرد پر بھی کئی قسم کے شک کیے جاتے ہیں۔ اس میں کئی نقائص ڈھونڈ لیے جاتے ہیں۔ بیوی نے اسے کیوں چھوڑا؟ کیوں بیوی نے اس سے طلاق حاصل کی؟'' ان کی حساس طبیعت کی طرح ان کا لب ولہجہ بھی بڑا احساس اور نپا تُلا تھا۔ ''ایسے مرد کا خود پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ شادی کا نیا پیغام دیتے ہوئے اُسے جھجک ہوتی ہے۔ سماج یہ نہیں دیکھتا کہ عورت کبھی محض

پُرکشش مرد، دولت اور وجاہت یا شہرت کے لیے اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور بولے۔ "نعیم! مظلوم صرف عورت اکیلی نہیں ہوتی۔"

(بانو، نئی دہلی)

OO

نام

وہ مجھے رات کے آخری شو کے بعد ملا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے۔ ایک تانگہ آخری چار پانچ فلم بینوں کو لے کر ہمارے سامنے سے گزرا۔ سڑک پر صرف ہم دو تھے۔

"کہاں جانا ہے؟"

"رام نگر۔"

"مجھے بھی وہیں جانا ہے۔" وہ بولا۔ "آؤ پیدل چلتے ہیں۔" اس کے لہجے میں تحکم سا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کا چہرہ ٹھیک طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اُس نے اپنے دونوں کان مفلر میں لپیٹ رکھے تھے۔

"بالکل بکواس فلم ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "ہندو مسلم ایکتا کا ایک جھمیلا کھڑا کیا ہے۔ مسلمان سیدھی راہ پر کہاں آتے ہیں؟"

کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ میں سٹپٹایا۔

"یہ لوگ روز کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی فساد کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

عجیب آدمی ہے۔ جان نہ پہچان۔ اپنی ہی سنائے جاتا ہے — میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"کیوں جی، آپ مانتے ہیں نا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہتا رہا۔ "اس ملک میں رہنا ہے تو ہر ایک کو اچھے شہریوں کی طرح ذمہ داری سے رہنا چاہیے۔"

میں نے دل ہی دل میں ارادہ کرلیا کہ اگر وہ میرا نام پوچھے گا تو دوسرا نام بتاؤں گا، اس

کے ساتھ پیشہ بھی بدلنا ہوگا اور گھر کا پتہ بھی۔

وہ برابر بولے جارہا تھا۔

''یہ خود تو ہندوؤں کے محلے سے اپنے جلوس لے جاتے ہیں، لیکن ان کے محلوں سے ہندو جلوس نکالیں تو ہنگامہ بپا کردیتے ہیں۔ جلوس پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ تیزاب پھینکتے ہیں۔ مندر مسجد کا جھگڑا کھڑا کرتے ہیں۔''

اس درمیان میں نے دل ہی دل میں اپنا نام رام لال رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک معصوم سا پیشہ اختیار کیا اور گھر کا بھی پتہ بدل دیا۔

کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''قومی دھارے میں یہ لوگ شامل ہونے سے رہے۔ دراصل ان کی نظریں اب بھی عرب اور ایران پر رہتی ہیں — ایسے لوگوں کو بھلا کوئی فلم کیا سدھار سکتی ہے؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

میں نے اُس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل نے کہا کہ اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اُسے بتادوں کہ فلم بہت سبق آموز ہے۔ یہ مختلف فرقوں میں اتحاد کا درس دیتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے دل نے چپکے سے کہا کہ کسی اجنبی سے بھڑنا مناسب نہیں۔ کنکھیوں سے میں نے اس کے جسم کو تولا۔ وہ قد میں مجھ سے اونچا تھا۔ اس کا سینہ بھی چوڑا چکلا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے طاقتور ہوگا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹوں پر دو لمبی لمبی مونچھیں ہیں اور سرخ سرخ انگاروں کی طرح اس کی دونوں آنکھیں دہک رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کی جیب میں چھرا ہو اور وہ رات کی تاریکی میں اُسے میرے سینے میں گھونپ دے۔ میں کانپنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی اور بچوں کے چہرے گھومنے لگے جو ابھی کھانا کھائے بغیر میرا انتظار کررہے ہوں گے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ مجھے جلد گھر پہنچنا ہے۔ مگر فوراً ہی میرے دماغ کے ایک خانے میں ایک تختی لٹک گئی جس میں موٹے موٹے حرفوں میں 'بزدل' لکھا تھا۔ تاہم میں نے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سمجھایا کہ کسی خبطی اور سنکی سے یوں ہی کسی بات پر اڑ جانا سراسر بے وقوفی ہے۔

وہ بے دریغ بولے جارہا تھا اور میں ہوں، ہاں کیے جارہا تھا۔

''لیکن ہندو کیا کم ہیں؟'' اس نے یکا یک رُخ بدلا۔ ''یہ بھی بڑے بدذات ہیں۔''

میں چونک پڑا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ حسب معمول مجھے دیکھے بغیر وہ کہتا رہا۔ ''یہ لوگ اقلیتوں پر نت نئے ظلم کرتے ہیں۔ انسان کا مرنا مارنا تو ان کے لیے بڑی بات نہیں۔ البتہ گئوکشی پر زمین آسمان ہلا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو شر پسند خود ہی بچھڑا مار کر اس کی لاش کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں یا کسی مندر سے مورتی چرا لیتے ہیں اور الزام مسلمانوں پر لگا دیتے ہیں۔ اس طرح بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کی راہ نکال لیتے ہیں۔''

میں نے دل ہی دل میں اپنا اصلی نام برقرار رکھا۔ اس کے ساتھ پیشہ اور گھر کا پتہ بھی وہی رکھا جو حقیقت میں ہے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ کیوں میں نے کچھ دیر پہلے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ ''ہندوؤں کو قومی ایکتا کی تلقین کرنے سے پہلے اقلیتوں کو امن سے رہنے کا سبق سکھانا چاہئے تھا۔ سرکار کب تک مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے پینترے بدلتی رہے گی؟ کب تک مسلمانوں کی ناز برداری کی جائے گی۔''

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ میں نے دوبارہ اپنا نام رام لال رکھا۔ اس کے ساتھ پیشہ اور گھر کا پتہ بھی بدل گیا۔ اپنی ذہنی کشمکش کو دباتے ہوئے میں نے اپنے ضمیر کو یہ دلاسا دیا کہ کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہئے۔ آخر مروّت بھی کوئی چیز ہے۔ کیوں اپنا اصلی نام بتا کر اس بے چارے کو شرمندہ کروں۔ وہ بے چارہ اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ میرا کیا جاتا ہے؟

''آپ کو فلم کیسی لگی؟'' وہ اچانک مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

''اچھی بھی نہیں کہہ سکتا، لیکن بری بھی نہیں۔'' میں نے جان بوجھ کر گول مول جواب دیا۔

''ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ پہلے ہی کی طرح مجھے دیکھے بغیر بولا۔ ''دراصل جیسی ہماری سرکار ہے ویسی ہی یہ فلم بھی ہے۔''

اب وہ سیاست دانوں کی خبر لینے لگا۔

''یہ نیتا لوگ ہی تو ہیں جو صرف اپنی گدی قائم رکھنے کے لیے لوگوں کو بہکاتے ہیں اور

ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں۔ عام لوگ بذاتِ خود اچھے ہوتے ہیں لیکن خودغرض سیاست دانوں کی لچھے دار باتوں میں آکر ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔''

پھر وہ سماجی انصاف اور انسان دوستی کی باتیں کرنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اصل بے وقوف میں بن گیا ہوں اور میرا وجود اصلی، نقلی نام کے چکر میں دو انسانوں میں بٹ کر، کلاک کے پنڈولم کی طرح لٹک رہا ہے۔

رام نگر کا بس اسٹینڈ کچھ دوری پر نظر آرہا تھا۔ مجھے یک گونہ اطمینان ہوا۔

''آپ تو کچھ نہیں بولے۔'' اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔

''آپ جو بول رہے تھے۔'' میں نے مبہم سا جواب دیا۔

''رام نگر میں آپ کہاں رہتے ہیں؟'' وہ پوچھ بیٹھا۔

میرا دل دھڑکنے لگا کہ وہ اب نام پوچھے گا اور اس کے ساتھ پیشہ اور گھر کا اتہ پتہ دریافت کرے گا۔ لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور دوبارہ اپنے دل کا غبار نکالنے لگا۔

''میرا بس چلے تو میں اس سرکار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں۔''

پاگل! سنکی! میں نے دل ہی دل میں اس کو گالی دی۔

بس اسٹینڈ کے پاس پرانی حویلی کی طرف جانے والی تنگ سڑک کے موڑ پر جب میں اس سے الگ ہوا تو اس نے اچانک اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں میرا ہاتھ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟''

''رام محمد۔'' میں ایسا ہڑبڑایا کہ میرے منہ سے غلط نام نکل گیا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنا نام درست کرتا۔ وہ بشاشت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے ڈی سوزا کہتے ہیں۔ میں یہاں کالج میں فلسفہ اور نفسیات پڑھاتا ہوں۔''

میں نے کھمبے کے بلب کی روشنی میں دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر نہ خوفناک مونچھیں تھیں اور نہ اس کی آنکھیں دہکتے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

(شمع، دہلی)

OO

مجرب نسخہ

جب کرپشن حد سے بڑھا تو انسدادِ رشوت ستانی کے موضوع پر شہر میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سول سوسائٹی کے ممبروں، مذہبی اور سیاسی جماعتوں، غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندوں، ویجی لنس کمیشن اور انتظامیہ کے ایک ایک افسر نے شرکت کی۔

کانفرنس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے سول سوسائٹی کے ایک سرکردہ رکن نے کہا: ''کرپشن نے وبائی صورت اختیار کی ہے سماج کا ہر طبقہ کرپشن سے نالاں ہے، ایک زمانہ تھا جب ایک آدمی رشوت لیتا تھا تو حیرت اور نفرت سے کہا جاتا تھا کہ فلاں رشوت لیتا ہے۔ آج ایک دیانت دار ملازم سے متعلق حیرت سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا یہ رشوت نہیں لیتا ہے۔ رشوت ستانی اور بدعنوانی ایک عیب نہیں بلکہ ایک لطیف فن بنا ہے۔ روزمرہ کی معمول کی زندگی کا دستور بن گیا ہے۔ جو ملازم مرتشی نہیں اس کو احمق سمجھا جاتا ہے۔''

دوسرا مقرر بولا: ''ایک جونیئر انجینئر سروس کرنے کے ایک سال کے اندر کار خریدتا ہے۔ بنگلہ تعمیر کرتا ہے جبکہ ایک ایمان دار چیف انجینئر اپنے آبائی خستہ حال مکان میں زندگی گزارتا ہے۔ اگرچہ دن کو چراغ لے کر ڈھونڈے بھی، شاذ و نادر ہی ایسا انجینئر نظر آتا ہے۔''

ایک مقرر بولا: ''جہاں رشوت چلتی ہے اور ناجائز آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے وہاں ہر راشی اپنی پانچوں انگلیاں اس گھی میں ڈالنے کے لیے کوشاں، سرگرداں اور بے تاب نظر آتا ہے۔ اس آسامی پر ٹکا رہنے کے لیے مٹھی گرم کی جاتی ہے۔ افسرانِ بالا کو حتیٰ کہ اوپر تک رقم اور تحفے تحائف بھیجے جاتے ہیں۔''

''جناب اوپر سے کیا مراد ہے؟ وضاحت کیجیے۔'' سامعین میں سے ایک من چلے آدمی نے فقرہ چست کیا۔ لیکن مقرر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا'' اس آسامی کے لیے بڑا سودا چلتا ہے۔ بڑے بڑوں سے سفارشیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ ایک آسامی سے ایک دیانت دار افسر کو تبدیل کر کے اس موٹی آسامی پر تعینات کرنے کے لیے ایک بدعنوان افسر نے دس لاکھ روپے صرف کیے۔''

ایک مقرر نے کہا کہ بدلتے ہوئے حالات میں رشوت لینے کے لیے نت نئے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ رشوت کا نام بدل کر کمیشن رکھا گیا ہے اور فیصد کے نام پر بڑی بڑی رقمیں اینٹھ لی جاتی ہیں۔

ویجی لنس کمیشن کے افسر نے اعداد وشمار کے ساتھ بتایا کہ اس کے محکمہ نے پچھلی ایک دہائی کے دوران متعدد رشوت خور اور بدعنوان ملازموں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے اور رواں سال کے دوران پانچ رشوت خور ملازموں کو رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ کر قانون کے شکنجے میں لایا ہے۔ اس نے حاضرین سے اپیل کی کہ ان کے محکمے سے تعاون کریں اور بدعنوان ملازموں کے کرتوت ان کی نوٹس میں لائیں۔

اس کے بعد کا مقرر بولا: '' حکومت چھوٹے ملازموں جیسے کلرکوں اور پٹواریوں کو پانچ سو یا ہزار روپے رشوت لینے کے لیے پکڑتی ہے اور سخت سزا دیتی ہے جبکہ بڑے بڑے مگرمچھوں کا بال بیکا نہیں ہوتا جو لاکھوں کروڑوں روپیوں کا گھپلا کرتے ہیں۔''

ایک مقرر بولا: ڈاکٹر ہسپتال میں مریضوں کو نہیں دیکھتے اور کلینکوں میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ استاد اسکول میں ایمانداری سے نہیں پڑھاتے ہیں اور طلباء ٹیوشن لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ٹریجری بدعنوانی کا گڑھ بنا ہے جہاں پنشن اور جی پی فنڈ کی ذاتی رقم کی ادائیگی پر روپیہ بٹورا جاتا ہے۔ اس نے محکمہ تعمیرات کے دفتر کے سامنے آویزاں اس بڑے بورڈ کو وہاں سے ہٹوانے کے لیے مطالبہ کیا جس پر لکھا ہے کہ رشوت دینا اور لینا دونوں جرم ہے۔ اس ضمن میں اس نے یہ جواز دیا کہ اس بورڈ کی آڑ میں رشوت دینے اور لینے میں آسانی رہتی ہے اور کسی کی نظر نہیں پڑتی۔

صرف ایک مقرر نے کہا کہ کلی طور پر کرپشن کو ختم کرنا مشکل ہے۔ البتہ اس مہم سے مثبت اثر پڑ سکتا ہے۔

ایک مولوی صاحب نے احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اسلام میں رشوت دینا اور لینا دونوں بڑا گناہ ہے۔ عبادت کے دس اجزا ہیں جن میں نو طلب حلال ہیں۔ جب رشوت دروازے سے داخل ہوتی ہے تو امانت کھڑکی سے نکل جاتی ہے۔ جب کوئی حرام کی کمائی کھاتا ہے تو چھ ماہ تک اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی ہے۔ اسلام نے حرام کی کمائی کرنے والوں سے کچھ بھی فائدہ اُٹھانا حرام قرار دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پانی پی پی کر ایک لقمہ اگل دیا، جب ان کو معلوم ہوا کہ کھانے کا وہ لقمہ حلال نہیں تھا۔ اس طرح حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ انہوں نے انجانے میں صدقہ کے اونٹ کا دودھ پیا ہے تو منہ میں ہاتھ ڈال کر سارے کا سارا قے فرما دیا۔

ایک اور مقرر نے کہا کہ ہر مذہب میں رشوت ستانی بڑا گناہ ہے اور ناجائز کمائی سے باز رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک مقرر نے الزام لگایا کہ چند سیاست داں جہاں اپنے منظور نظر بدعنوان ملازموں کو بچانے میں لگے ہیں جن کو وہ اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہاں اپنے مخالف ملازموں کو اپنے ستم کا تختۂ مشق بنا رہے ہیں۔ اس نے سوال کیا کہ ان بدعنوان ملازموں کو کیوں سزا نہیں دی گئی؟ زوردار تالیوں سے اس کے بیان کا خیر مقدم کیا گیا۔ بھیڑ میں سے ایک آواز آئی کہ کئی کرپٹ افسروں کو وزیروں اور سیاست دانوں کی سرپرستی حاصل ہے۔

ایک سیاسی پارٹی کے نمائندے نے کہا کہ رشوت ستانی کے لیے ہم بھی ذمہ دار ہیں۔ میرے مشاہدے میں آیا ہے کہ کئی دفعہ رشوت دینے میں ہم پہل کرتے ہیں جس سے رشوت خوروں کی ہمت بڑھتی ہے اور کرپشن کو تقویت ملتی ہے۔

مجلس میں ایک آدمی اٹھا اور بولا کہ خوشی سے کوئی رشوت نہیں دیتا ہے۔ حالات رشوت دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ محکمہ مال میں میری زمین کا ایک ایک کیس تھا۔ اس کے لیے مجھے بار بار گاؤں سے شہر آنا پڑتا تھا۔ متعلقہ ملازمین روزانہ کچھ نہ کچھ بہانہ

کرتے تھے۔ آنے جانے میں گاڑی کا خرچ اور ہوٹل میں رہنے اور کھانے پینے کا خرچ میرے لیے ایک بڑا بوجھ تھا۔ ایک روز مجبور ہو کر دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے مٹھی گرم کی اور ایک دم میں میرا کام ہو گیا۔

کئی آدمیوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات صحیح ہے۔ ہم غریبوں کی کوئی نہیں سنتا ہے۔

اس مرحلے پر ایک آدمی نے ایک واقعہ سنا کر پوری مجلس کو چونکا دیا۔ ہماری مسجد کے امام صاحب نے جمعہ کے ایک خطبہ میں رشوت خوری اور بد دیانتی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حدیث کے مطابق جو شخص ایک کپڑا دس درہم میں مول لے اور اس کی قیمت میں ایک درہم حرام ہو تو وہ کپڑا جب تک اس کے بدن پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرے گا۔ حضرت حسنؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے ایک اور حدیث سنائی کہ جس شخص کی نماز اس کو بری باتوں سے نہ روکے وہ نماز ہی نہیں۔ اس نماز کی وجہ سے اللہ سے دوری پیدا ہوتی ہے۔

اس وعظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد میں نمازیوں کی تعداد میں بڑی کمی آئی۔ دو تین بھولے بالے آدمی کپڑے بدل کر نماز پڑھنے آئے۔ اس بات پر مجلس قہقہہ زن ہوئی۔

کچھ مدت بعد جمعہ پر یہی مولوی صاحب بولے۔ نماز کا اپنا ثواب ہے اور رشوت لینے کا اپنا گناہ ہے۔ اس کے بعد دوبارہ نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

تقاریر کے بعد مباحثہ ہوا۔ کئی افراد نے انفرادی طور پر اپنے مسائل سے آگاہ کیا اور شکایت کی کہ آئے دن رشوت کی مانگ کی وجہ سے انہیں قدم قدم پر مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

ویجی لنس کمیشن اور انتظامیہ کے افسران نے یقین دلایا کہ وہ ان کے مسائل حل کرنے کے لیے اپنا پورا تعاون دیں گے۔ انہوں نے ایک دفعہ اور اپیل کی کہ وہ انہیں صورت حال سے باخبر رکھیں۔ اطلاع دینے والے کے نام صیغہ راز میں رکھے جائیں گے۔

سامعین میں سے ایک آدمی نے اپنے پہلو میں بیٹھے گھٹے گھٹے بدن کے ٹھگنے قد آدمی سے کہا۔ ''رجب! تم بھی اپنا مسئلہ بتاؤ۔ یہ اچھا موقع ہے۔''

''میرا مسئلہ ان سے مختلف ہے منوہر۔ قدرے پیچیدہ بھی ہے۔'' رجب دھیمی آواز میں بولا۔ ''اگر میں شکایت کروں تو الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کیسے؟''

''میں بعد میں بتاؤں گا۔'' رجب آہستہ سے بولا۔

کانفرنس کے اختتام پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں رشوت نہ دینے اور لینے کا عہد کیا گیا تھا اور حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ عوامی زندگی کو بدعنوانیوں سے پاک کیا جائے اور بددیانت افسروں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ تمام تنظیمیں ایک ہو کر کرپشن کی بدعت کے خلاف مؤثر مہم چلائیں گی۔

عوامی بہبود کی ایک غیر سرکاری تنظیم کے صدر نے قرار دادا پڑھ کر سنائی۔ اس نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اس کے ساتھ اونچی آواز میں یہ نعرہ بلند کریں۔

''ہم نہ رشوت دیں گے اور نہ رشوت لیں گے۔''

سبھوں نے اس نعرے کو تین دفعہ بلند کیا اور آڈیٹوریم کے در و دیوار گونج اٹھے۔

آخر میں کانفرنس کے کنوینر نے اعلان کیا کہ کانفرنس کے سارے شرکاء جلوس کی صورت میں شہر کے بازاروں اور سڑکوں پر گشت کریں گے تاکہ ان کا پیغام شہر کے تمام لوگوں تک پہنچے۔ شہر کے مرکزی چوک پر جلوس ختم ہوگا جہاں ایک مختصر جلسہ ہوگا۔

اس سلسلے میں بڑے بڑے پلے کارڈ بنائے گئے تھے جن پر موٹے موٹے حروف میں رشوت ستانی اور کرپشن کے خلاف نعرے لکھے گئے تھے۔ کانفرنس کے منتظموں کی درخواست پر اسکولوں کے طلبا پہلے ہی آڈیٹوریم کی ڈیوڑھی پر جمع ہوگئے تھے۔ ان میں کئیوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینر تھے۔ جہاں جہاں سے جلوس گزرا، لوگ اس میں شامل ہوتے گئے۔ جلسہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے شرکاء کی تعداد کئی ہزار ہوگئی۔ چوک پر کئی مقرروں نے کرپشن کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں اور نعروں کے درمیان جلسہ ختم ہوا۔

''تمہارے کیس میں کیا پیچیدگی ہے رجب؟'' گھر لوٹتے ہوئے منوہر نے رجب سے پوچھا۔

''میرا سروس بک کھو گیا تھا۔'' رجب بولا۔ ''تمام دفاتر میں جاکر بڑی مشکل سے سروس بک بنا لیکن ایک مہینے کی سروس کا تنازعہ رہا ہے، جب میں چھٹی پر گیا تھا۔ آفس میں اس کی منظوری کی نقل کھوگئی ہے۔ پچیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے پاس اس رخصت رعایتی کا حکم نامہ ہے لیکن متعلقہ ڈسپیچ کلرک اس پر ڈسپیچ نمبر اور تاریخ ڈالنا بھول گیا ہے۔ اس لیے پنشن کی منظوری کا معاملہ لٹکا ہوا ہے۔ میں نے دوبارہ عرض داشت پیش کی ہے، اُمید ہے مسئلہ حل ہوگا۔''

محمد رجب بطور سپر وائزر ریٹائر ہوا تھا۔ ریٹائر ہونے سے دو ماہ پہلے معلوم ہوا کہ اس کا سروس بک محکمہ میں نہیں ہے۔ اس نے اپنے سابقہ دفتر فون کیا جہاں اس نے اس سے پہلے کام کیا تھا۔ ایک رفیق کار نے جواب دیا کہ اس کا سروس بک اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر بھیجا گیا ہے۔ وہ یہ نمبر اور تاریخ لے کر اے جی کے دفتر گیا اور متعلقہ کلرک سے ملا۔ اس نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا کہ سروس بک اس کے صدر دفتر بھیجا گیا ہے اور نمبر اور تاریخ لکھ کر دی۔ اس کو پریشان دیکھ کر کلرک نے دلاسا دیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، سروس بک ہمیشہ رجسٹری ڈاک سے بھیجا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ادھر ادھر چلا جائے تو دفتر ہذا ذمہ دار ہے۔

وہ صدر دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں سے دفتر منتقل ہوا اور سارا ریکارڈ ذیلی دفتر چندی گڑھ میں موجود ہے۔ وہ دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر چندی گڑھ روانہ ہوا۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ پورا ریکارڈ نہیں پہنچا ہے۔ اس نے سنا کہ چندی گڑھ دفتر منتقل ہونے کے دوران ریکارڈ ایک جگہ پر رہا۔ اس دوران بہت سارے کاغذات تلف ہوئے جن میں کئی سروس بک بھی شامل تھے۔ اس سے پہلے دو ملازم اپنے سروس بک کی تلاش میں یہاں پہنچے تھے اور مایوس واپس چلے گئے تھے۔ تب سے لمبا عرصہ ہوا تھا۔ وہ سارے ذمہ دار افسران ریٹائر ہوئے تھے جن کا محاسبہ ہوسکتا تھا۔

یہ جان کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ پیروں تلے زمین نکل گئی۔

رجب نے منوہر سے کہا۔ ''میں نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے پنشن کی گریچوٹی اور جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقم سے اپنے مکان میں دو کمرے بڑھانے کا ارادہ کیا تھا اور چھوٹی بیٹی کی

''میرا مسئلہ ان سے مختلف ہے منوہر۔ قدرے پیچیدہ بھی ہے۔'' رجب دھیمی آواز میں بولا۔ ''اگر میں شکایت کروں تو الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کیسے؟''

''میں بعد میں بتاؤں گا۔'' رجب آہستہ سے بولا۔

کانفرنس کے اختتام پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں رشوت نہ دینے اور لینے کا عہد کیا گیا تھا اور حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ عوامی زندگی کو بدعنوانیوں سے پاک کیا جائے اور بددیانت افسروں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ تمام تنظیمیں ایک ہوکر کرپشن کی بدعت کے خلاف مؤثر مہم چلائیں گی۔

عوامی بہبود کی ایک غیر سرکاری تنظیم کے صدر نے قرار دادا پڑھ کر سنائی۔ اس نے حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اس کے ساتھ اونچی آواز میں یہ نعرہ بلند کریں۔

''ہم نہ رشوت دیں گے اور نہ رشوت لیں گے۔''

سبھوں نے اس نعرے کو تین دفعہ بلند کیا اور آڈیٹوریم کے در و دیوار گونج اٹھے۔

آخر میں کانفرنس کے کنوینر نے اعلان کیا کہ کانفرنس کے سارے شرکاء جلوس کی صورت میں شہر کے بازاروں اور سڑکوں پر گشت کریں گے تاکہ ان کا پیغام شہر کے تمام لوگوں تک پہنچے۔ شہر کے مرکزی چوک پر جلوس ختم ہوگا جہاں ایک مختصر جلسہ ہوگا۔

اس سلسلے میں بڑے بڑے پلے کارڈ بنائے گئے تھے جن پر موٹے موٹے حروف میں رشوت ستانی اور کرپشن کے خلاف نعرے لکھے گئے تھے۔ کانفرنس کے منتظموں کی درخواست پر اسکولوں کے طلبا پہلے ہی آڈیٹوریم کی ڈیوڑھی پر جمع ہوگئے تھے۔ ان میں کئیوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینر تھے۔ جہاں جہاں سے جلوس گزرا، لوگ اس میں شامل ہوتے گئے۔ جلسہ گاہ تک پہنچتے پہنچتے شرکاء کی تعداد کئی ہزار ہوگئی۔ چوک پر کئی مقرروں نے کرپشن کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں اور نعروں کے درمیان جلسہ ختم ہوا۔

''تمہارے کیس میں کیا پیچیدگی ہے رجب؟'' گھر لوٹتے ہوئے منوہر نے رجب سے پوچھا۔

"میرا سروس بک کھو گیا تھا۔" رجب بولا۔ "تمام دفاتر میں جا کر بڑی مشکل سے سروس بک بنا لیکن ایک مہینے کی سروس کا تنازعہ رہا ہے، جب میں چھٹی پر گیا تھا۔ آفس میں اس کی منظوری کی نقل کھو گئی ہے۔ پچیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے پاس اس رخصت رعایتی کا حکم نامہ ہے لیکن متعلقہ ڈسپیچ کلرک اس پر ڈسپیچ نمبر اور تاریخ ڈالنا بھول گیا ہے۔ اس لیے پنشن کی منظوری کا معاملہ لٹکا ہوا ہے۔ میں نے دوبارہ عرض داشت پیش کی ہے، اُمید ہے مسئلہ حل ہوگا۔"

محمد رجب بطور سپر وائزر ریٹائر ہوا تھا۔ ریٹائر ہونے سے دو ماہ پہلے معلوم ہوا کہ اس کا سروس بک محکمہ میں نہیں ہے۔ اس نے اپنے سابقہ دفتر فون کیا جہاں اس نے اس سے پہلے کام کیا تھا۔ ایک رفیق کار نے جواب دیا کہ اس کا سروس بک اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر بھیجا گیا ہے۔ وہ یہ نمبر اور تاریخ لے کر اے جی کے دفتر گیا اور متعلقہ کلرک سے ملا۔ اس نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا کہ سروس بک اس کے صدر دفتر بھیجا گیا ہے اور نمبر اور تاریخ لکھ کر دی۔ اس کو پریشان دیکھ کر کلرک نے دلاسا دیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ سروس بک ہمیشہ رجسٹری ڈاک سے بھیجا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ادھر ادھر چلا جائے تو دفتر ہذا ذمہ دار ہے۔

وہ صدر دفتر گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں سے دفتر منتقل ہوا اور سارا ریکارڈ ذیلی دفتر چندی گڑھ میں موجود ہے۔ وہ دفتر سے ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر چندی گڑھ روانہ ہوا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ پورا ریکارڈ نہیں پہنچا ہے۔ اس نے سنا کہ چندی گڑھ دفتر منتقل ہونے کے دوران ریکارڈ ایک جگہ پر رہا۔ اس دوران بہت سارے کاغذات تلف ہوئے جن میں کئی سروس بک بھی شامل تھے۔ اس سے پہلے دو ملازم اپنے سروس بک کی تلاش میں یہاں پہنچے تھے اور مایوس واپس چلے گئے تھے۔ تب سے لمبا عرصہ ہوا تھا۔ وہ سارے ذمہ دار افسران ریٹائر ہوئے تھے جن کا محاسبہ ہو سکتا تھا۔

یہ جان کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پیروں تلے زمین نکل گئی۔

رجب نے منوہر سے کہا۔ "میں نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے پنشن کی گریچوٹی اور جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقم سے اپنے مکان میں دو کمرے بڑھانے کا ارادہ کیا تھا اور چھوٹی بیٹی کی

شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یہ خواب بکھرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ میری حالت زار دیکھ کر آفس سپرنٹنڈنٹ بولا۔ ابھی ایک راستہ ہے۔ جہاں جہاں کام کیا ہے وہاں سے اپنا سروس رِیکارڈ لاؤ۔ اس طرح دوبارہ سروس بک بنتا ہے۔

رجب کے لیے یہ امید کی آخری کرن تھی۔ وہ آفس سے نکلا، اپنی بیوی اور بیٹے بیٹیوں کو سنانے کے لیے اس کے پاس صرف بری خبر تھی۔ اس نے ان کے سامنے کئی مرتبہ اپنے منصوبوں کا ذکر کیا تھا۔ اب تو وہ ماہانہ پنشن سے بھی محروم ہو رہا تھا۔

تین ماہ بعد میں میعادِ ملازمت کے کاغذات جمع کرنے میں کامیاب ہوا۔ رجب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''صرف ایک ماہ کی رخصت رعایتی کا مخمصہ ہے۔ ایڈمنسٹریٹو آفیسر پچیس سالہ حکم نامے کو مستند قرار نہیں دے رہا ہے۔ فائل پر اس نے یہی نوٹینگ کی ہے۔''

رجب نے مجبور ہو کر ایک سیاسی لیڈر سے سفارش کے لیے درخواست کی۔ اس نے ڈائریکٹر سے اس کا تذکرہ کیا۔ ڈائریکٹر نے ایڈمنسٹریٹو آفیسر کو بلایا۔ سیاسی لیڈر نے اے او سے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں اس معاملے میں اس غریب ملازم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ان کا ہے جنہوں نے اس سروس بک کو گنوا دیا ہے۔ پنشن ایک سرکاری ملازم کا لازمی حق ہے۔ ساری زندگی سرکار کی خدمت کرنے کے بعد سروس بک کی گمشدگی کے صورت میں اس کو اس کے لمبی ملازمت کے دوران ادا کی گئی خدمات کے عوض کی سزا مل رہی ہے۔ پنشن کے بغیر اس کو اور اس کے خاندان کو فاقہ کشی کرنی پڑے گی۔ متعلقہ کلرک نمبر دینا بھول گیا ہے۔ حکم نامہ تو موجود ہے۔ آپ اس پر رحم کریں۔''

رجب بولا۔ ''اب یہ معاملہ ایڈمنسٹریٹو افسر اور اس کے افسر کے درمیان ہے اس لیے ان کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''امید ہے وہ تمہارے حق میں فیصلہ دیں گے۔'' منوہر بولا۔ لیکن رجب کے حق میں فیصلہ نہیں ہوا۔ ایڈمنسٹریٹو افسر نے ایک دفعہ پھر کہا کہ وہ اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔

رجب نے محسوس کیا کہ ویجی لنس کمیشن کا افسر اب اس کا آخری سہارا ہے۔ ایک سال

گزر چکا تھا۔ اس نے ویجی لنس کمیشن کے افسر کو، جس نے کانفرنس سے خطاب کیا تھا، اپنی بپتا سنائی۔ اس نے رجب سے کہا۔ ''یہ معاملہ ہمارے دائرہ کار میں نہیں آتا ہے کیونکہ اس میں غبن، خرد برد اور رشوت ستانی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا ہے۔ تاہم آپ کا مسئلہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ پنشن ہر ملازم کا بنیادی حق ہے۔ ہم محکمہ ہذا کو لکھیں گے کہ یہ انسانی مسئلہ ہے اس پر ہمدردانہ کارروائی کرے۔''

ایک ماہ بعد ویجی لنس کمیشن کی طرف سے خط آیا جس کے ساتھ محکمہ کا خط منسلک تھا، جس میں اظہارِ تاسف کے ساتھ لکھا تھا کہ یہ ایک تکنیکی اور انتظامی معاملہ ہے۔ اس لیے معینہ قاعدہ قانون سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

رجب کی اُمید کی آخری کرن بجھ گئی۔ وہ بادل ناخواستہ ایک دن دفتر گیا۔ ایڈمنسٹریٹو افسر اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں مُسن صورت کا ایک آدمی فائلوں کے انبار کے پیچھے اپنی نشست پر بیٹھا تھا جس کو رجب اکثر وہاں دیکھتا تھا۔

''اے او صاحب کہاں ہیں؟'' رجب نے پوچھا۔

''وہ آج چھٹی پر ہیں۔''

اس نے رجب کو اپنے پاس بلایا اور اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور بولا۔

''میں آپ کو بہت دنوں سے یہاں آتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔''

''جی ہاں۔ یہاں آتے آتے میرے جوتے گھس گئے ہیں۔''

''شاید آپ کے پنشن کا کیس ہے۔''

''آپ نے صحیح فرمایا۔''

''میں ایک نسخہ بتاتا ہوں۔ آپ نسخہ جانتے ہیں نا؟ ڈاکٹر مریض کو نسخہ لکھ کر دیتا ہے اور مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''میں بھی ایک مریض ہوں۔ ذہنی مریض۔'' رجب کی آنکھوں میں آنسو آئے۔

''میں سمجھتا ہوں۔ آپ اے او صاحب کو خوش کریں۔''

رجب مجسم سوال بن کر مُسن صورت آدمی کو دیکھنے لگا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ اس کو منالیں۔ منانے اور خوش کرنے کے لیے کچھ خرچنا پڑتا ہے۔"

رجب نے اس نسخہ پر عمل کیا۔ دیرینہ اعتراض یک لخت خارج ہوا اور پنشن کی راہ میں کھڑی ساری رکاوٹیں آن کی آن ڈھہ گئیں۔

(کشمیر عظمیٰ، سرینگر)

OO

کرید

''نہیں مالو پاپا، امی کو نہیں مالو۔''

وہ روتا ہوا پاپا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا لیکن پاپا نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پاپا جو کام اپنے ہاتھوں سے لے رہے تھے، امی زبان سے لے رہی تھیں۔ پھر پاپا کے دونوں ہاتھ تیز تیز چلنے لگے اور امی رونے لگیں۔

جب پاپا نے اپنے ہاتھ روک لیے تو اُن کی مٹھی میں امی کے سر کے کچھ بال تھے اور امی کے چہرے پر کئی جگہ خراشیں تھیں۔ کمرے کا سارا سامان تتر بتر تھا۔ صبح سے چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ امی کمرے کے ایک کونے میں جا کر رونے لگیں۔ وہ امی کی گود میں چلا گیا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

کمرے میں جھانکا، خاموشی طاری تھی اور ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔ پاپا کا غصے سے آگ بگولا چہرہ لمحہ بہ لمحہ شانت پڑنے لگا اور اس پر پشیمانی کی ہلکی سی غیر مرئی لکیریں تننے لگیں۔

پاپا کے مدھم ہوتے تیور دیکھ کر وہ توتلی زبان میں بولا۔

''اگر تم پھیل مالو گے تو میں تم کو مال ڈالوں گا۔''

پاپا کے گمبھیر چہرے پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ آئی اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

''امی جب میں بالا ہو جاؤں گا تو میں تم کو پاپا کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔'' اس کا ننھا سا وجود امی کو تسلی دینے لگا۔

پاپا کے جانے کے کچھ دیر بعد انکل جمیل دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں

پلاسٹک کا ایک تھیلا تھا جس میں اس کے لیے پھل تھے۔ انکل کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھِل گئیں۔ انکل نے پھلوں کا تھیلا اس کے ہاتھ میں دیا اور خود امی کی جانب بڑھا۔ امی کا چہرہ دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک گیا۔

''کیا آج پھر اس نے ہاتھ اٹھایا؟'' انکل جمیل نے پوچھا۔

امی نے جواب نہیں دیا اور چپکے سے آنسو بہانے لگیں۔

انکل امی کو دلاسا دینے لگا۔

ننھے نے جب سے آنکھیں کھولیں تو گھر میں یہی ہنگامہ دیکھا۔ پہلے پاپا اور امی کے درمیان کچھ تو تو میں میں ہوتی جو فوراً گرما گرمی کی صورت اختیار کرتی۔ تب پاپا کا ہاتھ اٹھتا تھا۔ امی روتی چلاتی تھیں۔ پھر کئی روز تک گھر کی چار دیواری میں ایک تکلیف دہ کھچاؤ رہتا تھا۔ شروع شروع میں جب کبھی جھگڑا ہوتا، پڑوس کی آنٹی سنیتا، چچی جمیلہ اور ان کا شوہر صادق آجاتے تھے۔ وہ بیچ بچاؤ کر کے اور سمجھا بجھا کر چلے جاتے تھے لیکن روز روز کے جھگڑوں کے بعد انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔

پاپا اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر سے اکثر باہر رہتے تھے۔ وہ عام طور پر ہفتے عشرے کے بعد گھر لوٹتے۔ کبھی کبھی مہینہ یا اس سے زیادہ مدت لگا دیتے تھے۔

ایک دفعہ پاپا دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کے لیے کیا تحفہ لایا جائے۔ اس نے پاپا کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر کہا۔ ''پاپا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم امی کو کبھی نہیں مارنا۔''

''کبھی نہیں ماروں گا۔'' پاپا نے اس کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

لیکن دو روز بعد جب پاپا گھر لوٹے تو امی کو پھر مارا تھا۔

پاپا نے ایسے کئی وعدے کیے تھے لیکن یہ سارے وعدے عارضی ثابت ہوئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس ماحول کا عادی ہو گیا۔ اس کے دل میں پاپا کے خلاف گہری نفرت پلنے لگی اور امی کے لیے اس کے روئیں روئیں میں ہمدردی جاگ اُٹھی۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو پاپا نے اس کو نرسری میں داخل کیا۔ اور وہ اپنا زیادہ وقت

بچوں کے ساتھ نرسری اور کھیل کود میں گزارنے لگا۔

ایک روز وہ جلدی گھر لوٹا۔ جب سیڑھیاں پھلانگ کر وہ صحن میں آیا تو اندر کمرے سے پاپا کی گرجناک آواز آئی۔ اس کا دل ایک لمحے کے لیے دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے کی آڑ میں دیوار سے ٹیک لگائے سننے لگا۔

''تم کیوں میری غیر موجودگی میں اس بدمعاش کو گھر آنے دیتی ہو؟'' پاپا زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ''کب تک تم اس طرح میری زندگی میں زہر گھولتی رہوگی؟''

پھر اس کے کانوں میں امی کی سسکیوں کی آواز آئی۔

پاپا کہہ رہے تھے۔ ''تم نے میری زندگی کو اجیرن کر دیا ہے رضیہ۔ مجھے معصوم بچے پر ترس آتا ہے ورنہ میں نے تم کو کب کا چھوڑ دیا ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔''

وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا۔

''پاپا! تم نے امی کو کیوں مارا؟ بتاؤ پاپا!'' وہ روہانسا ہوکر بولا۔

''تم نہیں سمجھوگے بیٹا۔ تم نہیں سمجھوگے!'' پاپا جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اس نے پہلی بار پاپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

وہ حیران ہوا۔ پاپا مارتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔

''تم کیوں رو رہے ہو پاپا؟''

''کچھ نہیں بیٹا، کچھ نہیں۔'' پاپا نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

چند روز کے بعد پاپا پھر سفر پر روانہ ہوئے اور انکل جمیل روز گھر آنے لگا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ پاپا گھر نہیں لوٹے۔ ایک روز ڈاکیہ آیا اور اس نے پاپا کی طرف سے اس کے نام ایک خط اور تین سو روپے کا منی آرڈر دیا۔

وہ اب نرسری سے اسکول میں آگیا تھا۔

دوسرے ماہ ڈاکیہ دوبارہ آیا اور اس کو پاپا کے بھیجے ہوئے تین سو روپے کے منی آرڈر کی رقم دے گیا۔

اس طرح کئی مہینے بیت گئے۔ پاپا گھر نہیں آتے لیکن ہر ماہ ڈاکیہ بلاناغہ منی آرڈر سے بھیجی ہوئی رقم لاتا تھا۔

پھر ڈاکیہ کا آنا بند ہوگیا۔ اس کے بجائے ایک اور آدمی آیا۔ اس نے بھی ڈاکیے کی طرح خاکی وردی پہنی تھی۔ اس آدمی نے امی کو ایک لفافہ دیا۔ سفید رنگ کے لفافے میں سے امی گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگیں۔ اچانک کاغذ امی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور وہ رونے لگیں۔

''امی! کیوں رو رہی ہو؟'' وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

امی نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر سے آنچل اٹھایا۔

امی کا چہرہ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی امی بولیں۔

''تمہارے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے بیٹا۔''

امی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ایک ہفتے بعد وہ دوبارہ اسکول جانے لگا لیکن اسی شام اسکول کا چپراسی اس کے خلاف ہیڈ ماسٹر کی شکایت لے کر آیا۔ اس نے ایک بچے کو اسکول کی چھت سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ نت نئی شرارتوں کے لیے ہیڈ ماسٹر نے پہلے بھی کئی دفعہ اس کے خلاف امی سے شکایت کی تھی۔

ایک روز اس نے کلاس میں اجے کی دوات اُلٹ دی۔ اجے نے غصے سے اس کو حرامی کہا۔ وہ آپے سے باہر ہوگیا اور اجے کی ناک پر ایک مُکا رسید کر دیا۔

اجے اپنی ناک سہلاتا ہوا بچوں سے بولا۔ ''یہ حرامی بچہ ہے۔ تم لوگ اس کو کل سے حرامی بچہ کہنا۔''

اس روز سے جب بھی کسی بچے سے اس کی لڑائی ہوتی وہ اس کو حرامی بچہ کہہ کر چڑاتا۔ اس نے امی سے شکایت کی کہ بچے اس کو حرامی کہتے ہیں۔

امی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''جب باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم ان باتوں کی

طرف بالکل دھیان نہ دو بیٹے اور خاموشی سے اپنی پڑھائی جاری رکھو۔''

اس کے چند روز بعد وہ چچی جمیلہ کے بیٹے مجید کے ساتھ اسکول سے لوٹ رہا تھا۔ مجید نے اس سے پوچھا۔

''لمبو جمیل تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟'' لمبے قد کی وجہ سے سبھی جمیل کو لمبو جمیل کہتے تھے۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''تم اپنے باپ کے بیٹے نہیں ہو شکیل۔'' مجید اچانک بول اٹھا۔

''پھر میں کس کا بیٹا ہوں؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''تم جمیل کے بیٹے ہو۔ جو تمہارے گھر آتا رہتا ہے۔'' مجید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کون کہتا ہے؟'' اس کی مٹھی بھنچ گئی۔

''میری امی کہتی ہے۔''

''نہیں، نہیں۔ میں انکل جمیل کا بیٹا نہیں ہوں۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''وہ میرے انکل ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجید پر مکّوں کی بارش کر دی اور مجید روتا ہوا گھر چلا گیا۔

وقت رینگتا ہوا گزرنے لگا۔ وہ اور ماں، باپ کی بچائی ہوئی رقم پر جی رہے تھے۔

وہ اب پانچویں جماعت میں پہنچا تھا۔ چچی جمیلہ نے ایک روز اس کو اپنے پاس بلایا۔

''لمبو جمیل آج کل نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ کہاں گیا؟'' چچی نے پوچھا۔

''کل ہی تو انکل ہمارے ہاں آئے تھے چچی۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''وہ تمہارا انکل تو نہیں ہے۔ تمہارے پاپا کا کوئی بھائی نہیں۔ وہ تو نرا لفنگا ہے۔ تمہاری ماں ایسے آدمی کو گھر آنے کیوں دیتی ہے؟''

چچی جمیلہ کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ اس نے اس طنز کو محسوس کیا۔ وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر واپس آگیا لیکن اس کے دل میں ایک کرید پیدا ہوئی اور وہ بے چین رہنے لگا۔ اس نے اس بات کو بھلانے کی بڑی کوشش کی لیکن جتنی وہ کوشش کرتا اتنی ہی ایک پھانس کی طرح اس کے دل میں یہ بات چبھنے لگتی۔ پھر یہ پھانس اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی اور وہ اس کو

اپنے دل سے نکالنے کے لیے بے تاب رہنے لگا۔ وہ امی کو عجیب نظروں سے گھورنے لگا۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے ہوئے اس کا ہاتھ رُک جاتا اور وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ امی نے کئی بار اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اندر ہی اندر کرید اس کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔

ایک روز اس نے اپنے جگری دوست رفعت کو اکیلے میں پکڑ لیا۔

''رفعت! کیا میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہوں؟''

رفعت حیرت سے اس کا منہ تاکنے لگا۔

''یار، خدارا مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، صاف صاف بولو۔''

''کیسی بات کرتے ہو؟ تم تو بالکل اپنے باپ پر گئے ہو شکیل۔ بالکل ویسی ہی آنکھیں، ویسی ہی آواز اور رُخسار پر ہو بہو ویسا ہی تِل۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

''یہ سارا جھگڑا جھمیلا لمبو جمیل کا پیدا کیا ہوا ہے جسے تم انکل کہہ کر پکارتے ہو۔''

''کیسا جھگڑا جھمیلا؟'' اس نے سوال کیا۔

لیکن رفعت نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ وہ ماں سے یہ راز معلوم کر کے ہی دم لے گا۔

''ماں!'' پہلی دفعہ اس نے ماں کو امی کے بجائے ماں کہہ کر پکارا۔ وہ حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگیں۔

''ماں! جمیل ہمارے گھر میں روز روز کیوں آتا ہے؟ وہ ہمارا کیا لگتا ہے؟ سبھی کہتے ہیں وہ میرا انکل نہیں ہے۔ تمہیں میری قسم ماں! سچ سچ بتاؤ ورنہ میں زہر کھا لوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔''

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارسی پھوٹ پڑی۔

''بتاؤ ماں! حقیقت کیا ہے؟'' اس نے ماں کو جھنجھوڑا۔

''پاپا!'' اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز نکلی اور وہ ننگے فرش پر اوندھے منہ لیٹا زور زور سے رونے لگا۔

(ایوانِ اردو، دہلی)

OO

دل ہی تو ہے

مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ رفعت دفتر سے سویرے لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں دو پیکٹ تھے۔ ایک میں شاہد کے لیے نیکر، نوشین کے لیے فراک اور ننھے کے لیے کھلونے تھے۔ دوسرے میں سعیدہ کے لیے سینڈل اور کانوں میں جگمگ جگمگ کرتے ہوئے ٹاپس تھے۔

رفعت نے شاہد کی طرف ایک پیکٹ اُچھالتے ہوئے پوچھا۔

''امی کہاں ہیں؟''

سعیدہ اندر سے نکل آئی۔

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' رفعت خفگی سے بولا۔

''میں ابھی تیار ہوتی ہوں۔ کپڑے یہی ٹھیک ہیں نا؟''

سعیدہ اپنی قمیص اور شلوار میں سمٹتی ہوئی بولی۔

''کیا ساڑی نہیں باندھو گی؟''

''وہاں بہت لوگ ہوں گے۔ میں جھجک محسوس کر رہی ہوں۔''

''کیا وہ ساڑی اپنے کفن کے لیے رکھی ہے؟'' رفعت کا موڈ بگڑ گیا۔

سعیدہ نے خاموشی اختیار کی۔

''جاؤ۔ ساڑی لے آؤ۔'' رفعت متانت سے بولا۔

سعیدہ اس کا منہ تاکنے لگی۔

''میں کہتا ہوں ساڑی لے آؤ۔'' اس کا لہجہ یک لخت تحکمانہ ہو گیا۔

بادل ناخواستہ سعیدہ سفید ریشمی ساڑی لے آئی اور رفعت کے حوالے کیا۔

"دو ہفتے سے میں روز تمہیں ساڑی باندھنے کے لیے کہتا آرہا ہوں۔ ایک پتھر ہوتا وہ بھی پگھل جاتا۔"

رفعت نے جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اب میں اس ساڑی کو بالکل دیکھنا نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر اس نے دیا سلائی کی ایک تیلی جلائی اور ننھا سرخ شعلہ ساڑی کی طرف بڑھادیا۔

"کیا پاگل پن کی حرکت کر رہے ہو؟" سعیدہ نے اُچک کر رفعت کے ہاتھ سے ساڑی چھین لی۔

"جاؤ، چلی جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" رفعت نے سعیدہ کو جھنجھوڑا۔

سعیدہ کا چہرہ فق ہوا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "آپ مجھے کیوں جھنجھوڑ رہے ہیں؟ میں خود چلی جاتی ہوں۔" اس نے اپنے دوپٹے کا پلّو سنبھالا۔ دودھ پیتا ننھا بچہ ماں سے لپٹ گیا اور سعیدہ باہر جانے لگی۔

ماں نے بہو کو روکنے کی کوشش کی۔

"ماں، نہیں روکو۔ میں کہتا ہوں جانے دو اس کو۔" رفعت چلایا۔

"تم بہت جلد جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہو رفعت۔" سعیدہ کے چلے جانے کے بعد ماں نے شکوہ کیا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں آج کل ٹھیک نہیں رہتی ہوں۔"

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو ماں۔ میں تمہارے لیے کل ہی ایک نوکر کا انتظام کر رہا ہوں۔" رفعت بولا۔

رفعت شادی کی دعوت پر اکیلا نہیں گیا۔

سعیدہ کے چلے جانے کے بعد رفعت کی زندگی کا ڈگر بدل گیا۔ عمر رسیدہ ماں نے سعیدہ کی جگہ لے لی۔ گھر میں دو اور بچے تھے۔ بچوں کو روزانہ دھونا نہلانا، ان کے کپڑے دھونا، سینا پرونا اور گھر بار کو صاف ستھرا رکھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ شاہد اکثر نہائے دھوئے بغیر اسکول جانے لگا۔ تکیوں کے غلاف، بستر کی چادریں اور کھڑکیوں کی چلمنیں میلی پڑنے لگیں۔

رفعت روزانہ بستر میں چائے لیتا تھا۔ اس نے اب یہ عادت چھوڑ دی۔

رفعت کو یہ اُمید تھی کہ سعیدہ دو چار روز بعد لوٹ آئے گی لیکن دن پر دن گزرتے گئے، سعیدہ نہیں آئی۔ اس نے کئی جگہ نوکر دیکھے یا تو وہ موزوں نہیں لگے یا زیادہ اُجرت مانگتے تھے۔ ماں نے کئی بار بہو کو واپس لانے کے لیے کہا لیکن دل ہی دل میں چاہتا ہوا بھی رفعت کے لبوں تک 'ہاں' کا لفظ نہیں آیا اور وہ کہتا۔ "ماں! میں نے اس کو نکالا کب کہ میں اس کو بلاؤں۔ وہ خود اپنی مرضی سے گئی اور خود اپنی مرضی سے آئے گی۔" یہ اس کی انانیت بول رہی تھی۔

رفعت پریشان رہنے لگا اور دل ہی دل میں چاہنے لگا کاش سعیدہ واپس آجائے۔ اگر ایک دفعہ وہ آجائے تو اسے کبھی نہیں جھگڑے گا اور کبھی سخت الفاظ استعمال نہیں کرے گا۔

سعیدہ کو میکہ گئے تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ ایک روز بچی کو سخت بخار ہوا۔ اس رات رفعت پل بھر کے لیے نہیں سو سکا۔

"تم بہو کو کیوں بلا نہیں لیتے؟" ماں نے بھنا کر کہا۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ماں۔" اس نے رونی آواز میں ماں سے کمزور سا احتجاج کیا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تم اپنا جی کیوں ہلکان کرتی ہو ماں۔" وہ ماں کو تشفی دینے لگا۔ "میرے ایک دوست نے ایک نوکر دیکھ رکھا ہے۔ آج شام تک میں ہر صورت میں اس کو ساتھ لے کر گھر لوٹوں گا۔"

وہ صبح جلدی گھر سے نکل گیا اور اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔ شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر وہ گاؤں جانے والی سڑک پر آیا۔ سڑک کو پھاند کر وہ پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پھر پُلیا آئی۔ اس جانی پہچانی مانوس سی شکستہ پُلیا پر وہ سینکڑوں مرتبہ گزرا تھا۔ پُلیا کے پار داہنی طرف گلیارے میں اُس کا میکہ تھا۔ میکے سے کچھ آگے اس کے دوست کا مکان تھا۔ پلیا کے جنگلے پر اپنی چھاتی ٹکائے اس نے چند لمحے نالے میں بہتے ہوئے پانی کو دیکھا۔ پُلیا سے جب وہ گلیارے میں آیا تو اس کا دل اس اندیشے سے دھک دھک کرنے لگا کہ سعیدہ یا اس کے گھر کا کوئی فرد ملے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ محلے کا نل خاموش تھا۔ نل کے قریب موڑ سے سعیدہ کے میکے کا دریچہ نظر آرہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس نے اشتیاق سے دریچے کی طرف

دیکھا۔ وہاں سے اس نے بارہا حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ہریالے کھیتوں کو دیکھا تھا۔

وہ دل ہی دل میں چاہنے لگا کہ سعیدہ وہاں آجائے تو اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ نل سے گلی کے موڑ تک اور موڑ سے نل تک کئی بار چلا۔ ایسے میں کئی لوگوں سے آمنا سامنا ہوا۔ رفعت چند لمحوں کے لیے گھبرا گیا۔ سعیدہ کے ساتھ ننھا بچہ سامنے چبوترے پر بیٹھا تھا۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟'' رفعت نے پوچھا۔

''فہیم گھر میں بیٹھتا نہیں ہے۔'' سعیدہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

رفعت کو اپنے سینے سے ایک بھاری بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔'' وہ بولا اور بول کر اپنے آپ حیرت ہوئی کہ اس نے یہ کیا بولا۔

سعیدہ نے چپ چاپ فہیم کو سینے سے لگا یا۔

''چلو نا، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' رفعت پگھل گیا تھا۔

سعیدہ نے پیچھے مڑ کر اپنے گھر کی طرف نظر ڈالی۔

''میں تمہاری امی کو ابھی اپنا منہ نہیں دکھا سکتا ہوں۔ انہیں ہم کسی کی زبانی ابھی مطلع کریں گے۔'' رفعت نے سعیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

وہ پُل کے ناکے پر آئے۔

''معمولی سی بات پر ہم میں جھگڑا ہوا اور تم مجھے چھوڑ کر چلی آئیں۔'' رفعت بولا۔ ''میں تمہارا بدخواہ تو نہیں تھا۔ تمہیں نئی ساڑی میں دیکھنا چاہتا تھا۔''

سعیدہ نے کچھ جواب نہیں دیا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ رفعت دل کا برا نہیں ہے۔ اس کو دل سے چاہتا ہے۔ اگر جلدی غصہ آتا ہے تو جلدی پسیج بھی جاتا ہے اور پھر اپنے کیے پر پچھتاتا ہے۔ اس ایک ماہ کے دوران اس کے دل نے چپکے سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ اس کو اتنی جلدی رفعت کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔

''تم یوں روٹھ کر کبھی نہیں جاتی تھیں۔ نہ جانے اس روز مجھے بھی کیا ہوا۔'' رفعت گلوگیر لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

سعیدہ کے لب تھرتھرا کر رہ گئے۔

''آپ نے یہ کیا قمیص پہنی ہے۔ کالر کا میل دیکھیے!'' سعیدہ بولی۔

''لو جی، تمہیں ابھی سے میری قمیص ستانے لگی۔'' رفعت نے ہنس کر کہا۔

جب وہ پلیا پار کرنے لگے تو رفعت نے بہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری جدائی میں اس نالے میں اتنا پانی کبھی نہیں بہا جتنا اب کی دفعہ بہا ہے۔'' سعیدہ زیرلب مسکرائی۔

ماں کمرے میں نہیں تھی۔ شاہد اسکول سے نہیں لوٹا تھا۔ نوشین کھاٹ پر سو رہی تھی۔ سعیدہ نے گیس جلا کر چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھائی۔ جب پانی اُبلا۔ ماں سودا سلف لے کر گلی سے لوٹی۔ کمرے میں ایک نسوانی آواز سن کر ماں نے آہستہ سے کواڑ سرکا کر جب اندر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

(بیسویں صدی، دہلی)



دھوپ چھاؤں

شاید یہ زمانہ ہی نمبروں کا ہے، جیسے بچوں کی اسکول کی فیس کا نمبر، دودھ کا کوپن نمبر، بجلی کا بل نمبر، گیس سلنڈر نمبر، راشن کارڈ نمبر، پنساری کے بہی کھاتے کا صفحہ نمبر۔

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو غلام احمد کو ان نمبروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہ نمبرات اس کی تنخواہ کا بڑا حصہ کھا جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی نمبر بدل جاتا تھا اور غلام احمد کے لیے اسے یاد رکھنا مشکل بن جاتا تھا۔

کچھ نمبر خالی نمبر ہی تھے۔ جیسے غلام احمد نے سرکاری کوارٹر الاٹ کرانے کے لیے درخواست دی تھی اور اس کا نام محکمے کے ریکارڈ میں ۳۷ نمبر پر تھا۔ اسی طرح اسکوٹر کے لیے کمپنی کے رجسٹر میں اس کے نام سے آگے ۱۲۰ ارنام تھے۔ کبھی ان نمبروں میں ہیرا پھیری بھی ہو جاتی تھی اور ایک ضدی انسان کی طرح اس کا نمبر اپنی جگہ سے ٹس سے مَس نہیں ہوتا تھا۔

ان نمبروں کے علاوہ ایک نمبر اور بھی تھا۔ یہ تھا لائبریری کارڈ نمبر، جو غلام احمد کا محبوب نمبر تھا۔ اس نمبر پر کوئی روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اپنا نمبر بتا کر وہ لائبریری سے اپنے لیے کتابیں انتخاب کرتا اور دنیا کے تفکرات اور الجھنوں سے دور ایک نئی دنیا میں پناہ لیتا۔

نمبروں سے وابستگی کے علاوہ کیو میں رہنا بھی غلام احمد کی زندگی کا ایک دستور بن گیا تھا۔ دراصل نمبر اور کیو کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نمبر پیسے کھاتے ہیں اور کیو وقت کھاتا ہے اور یہ دونوں مل کر انسان کی جان کھاتے ہیں۔

بجلی کا بل بھرنا ہو، بچوں کی ماہانہ فیس اسکول میں جمع کرنی ہو یا راشن لینا ہو تو کیو میں

کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ اس کے جیسے اوسط طبقے کے سفید پوش آدمی کے لیے نوکر رکھنا بھی مشکل تھا۔

زندگی میں مسائل کی کیا کمی ہے؟ کچھ مسائل بڑے ہوتے ہیں اور کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ غلام احمد کے لیے چھوٹے مسائل یہ تھے کہ وہ اکثر کسی نمبر سے نمٹ نہیں سکتا تھا جیسے بجلی کا ابل ادا کرنے میں تاخیر ہوجاتی۔ وقت پر پنساری کا قرض بے باق نہ ہوتا۔ وقت پر راشن لانا دشوار ہوجاتا اور گھر میں آٹا، شکر نام کو نہ رہتا۔ ایسی الجھنیں تو آتی ہی رہتی تھیں لیکن وہ اِدھر اُدھر سے قرض لے کر یا کسی مد میں خرچ میں کفایت کر کے معاملہ نبھا لیتا تھا۔ تاہم بڑے مسائل تو پہاڑ کی طرح کھڑے تھے جیسے مکان کی تعمیر، ٹرانسفر کا چکر یا بیٹیوں کی شادی کے لیے بڑی رقم کی ضرورت۔

کوئی کب تک کرائے کے مکان میں رہے؟ مالک مکان کی روز روز کی دانتا کِل کِل۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ یہاں پانی نہ پھینکو، وہاں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر نہ لگاؤ اور پھر اُس کے بچوں اور مالک مکان کے بچوں میں آئے دن جھگڑے۔ ماں باپ کے آبائی مکان میں اس کے تین بھائی اور ان کے اہل و عیال رہتے تھے۔ گھر سے دور تبادلے کا نتیجہ الگ چولہا اور فاضل اخراجات تھا۔ کھانا پکانے میں انہیں بڑی کوفت ہوتی تھی کیونکہ بچپن سے ہی گھر میں پکا پکایا کھانا نصیب میں ہوتا رہا تھا۔

بیٹیاں ابھی چھوٹی تھیں لیکن اس زمانے میں جب شادی تجارت ہوگئی ہے پیٹ کاٹ کر بھی بیٹیوں کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا ضروری تھا۔

زندگی کی گاڑی کھٹارا سہی لیکن کسی طرح چل رہی تھی۔ دن بھر کی محنت اور تھکن کے بعد جب وہ شام کو زینب بیگم اور بچوں کے ساتھ بیٹھتا تو ساری کلفت اور تھکن دور ہوجاتی۔ بچوں کے معصوم قہقہے نئی طاقت بخشتے، زینب کی گھنی سیاہ زلفوں میں چھپا ہوا چاند سا مسکراتا چہرہ زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے کے آداب سکھاتا۔

اُن کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ حنا سب سے بڑی تھی اور تیرہ سال کی تھی۔ سیما پانچ سال کی تھی اور وسیم پانچ سال کا تھا۔ دو بیٹیوں کے بعد وسیم اُن کی اولادِ نرینہ کی خواہش کی تکمیل

تھا۔

زندگی دبے پاؤں آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ملازمت کے بیس سال گزر گئے۔ غلام احمد نے اپنا مکان تعمیر کیا اور کرائے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر حنا کی شادی ہوئی۔

لیکن ایک سانحہ گھات لگائے انتظار کر رہا تھا۔ وسیم طویل بیماری کے بعد بینائی سے محروم ہو گیا۔ غلام احمد نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن وسیم ٹھیک نہیں ہوا۔ غلام احمد کے لیے یہ زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنی پینتالیس سالہ زندگی کو دیکھا تو اتنا پہاڑ سا دُکھ زندگی میں کبھی نہیں سہا تھا۔ نشیب و فراز آئے، خوشی اور غم کے لمحات آئے، اکثر اوقات مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ماں باپ بڑھاپے کے بعد خدا کو پیارے ہوئے۔ ان حادثات نے اس کی زندگی میں کوئی خراش پیدا نہیں کی۔ لیکن وسیم کی آنکھوں کی روشنی جانے سے وہ اور بیگم ٹوٹ کر رہ گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں یہ تلخ تجربہ ہوا کہ ایک حادثہ ایک خاندان کو آناً فاناً تباہ کر سکتا ہے، اگر وسیم مر جاتا تو یہ صدمہ ایک دفعہ آتا۔ اگر وہ پیدائشی نابینا ہوتا تو بھی ٹھیک تھا۔ لیکن وسیم بارہ سال کا تھا۔ اس نے سورج کا اُجالا اور چاند کی چاندنی دیکھی تھی۔ دھنک کی سندرتا اور شفق کی لالی دیکھ کر وہ خوشی کے مارے اُچھلا کودا تھا۔

پہلے وسیم ٹی وی کے سامنے ڈٹا رہتا تھا۔ جب کبھی غلام احمد بچوں کی مرضی کے خلاف ٹی وی بند کر دیتا تو وسیم زمین پر لوٹتا تھا۔ اب تو غلام احمد نے ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ سیما ضد کرتی تو وہ اشاروں ہی اشاروں میں سمجھاتا کہ وسیم کا بھی خیال رکھو۔ وہ دیکھ نہیں سکتا، اسے تکلیف ہوگی۔

پہلے وسیم عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود سیما پر غالب آتا اور اسے مارتا تھا۔۔۔ اب سیما کا پلڑا بھاری رہتا تھا۔

وسیم اکثر پوچھتا۔ ''پاپا، میری آنکھیں کب ٹھیک ہوں گی؟ میں کب دیکھ سکوں گا؟''

غلام احمد اور بیگم کے دل پر آری سی چلتی تھی۔ وہ آنسو پی کر کہتے: ''جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے، بیٹا۔''

''میری آنکھیں کیوں نہیں پھوٹیں؟ ہمارے گناہوں کی سزا بچے کو کیوں ملی؟'' بیگم روہانسی ہو کر کہتی۔

''میں تم کو بار بار کہتا تھا زینب کہ بات بات میں 'ہائے' نہ کہا کرو۔'' غلام احمد نے ایک روز بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہائے کرنے کا دن تو آج آیا ہے۔ گھر میں آٹا، شکر نہ ہو تو آسمان نہیں ٹوٹا تھا۔ اب آٹے، شکر کی کمی نہیں ہے۔ اپنا گھر بار ہے لیکن بچے کی بصارت چھن گئی ہے۔ یہ ہمارے ناشکرے پن کی سزا ہے زینب۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے، صرف اپنے بچے کی آنکھیں چاہئیں۔'' زینب نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

دنیا ان کے لیے اتنی بری پہلے کبھی نہیں تھی۔ اب میاں بیوی دنیا کو ایک نئے انداز میں دیکھنے لگے۔ ایک خلش تھی یا پھانس تھی جو ہر وقت دل میں ترازو رہتی۔ عید اور خوشی کے موقع پر سب سے پہلے وسیم اُن کے دل میں گھس جاتا اور ساری خوشیاں یک لخت کافور ہو جاتیں۔

ایک روز بیگم بولی۔ ''جو لوگ برائیاں کرتے ہیں اُن کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہم نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا، کسی کا حق نہیں مارا پھر ہمیں اتنی بڑی سزا کیوں ملی ہے، احمد؟''

غلام احمد نے سوچا کہ زینب ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے بیگم کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا شکر بجا لاؤ زینب، ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ جب قہر الٰہی آتا ہے تو انسان خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ بھونچال، سیلاب اور طوفان سے خاندان کے خاندان ختم ہو جاتے ہیں۔''

وہ زینب کو مثالیں دینے لگا لیکن اندر ہی اندر اس کا دل رو رہا تھا۔

ایک روز قصبے میں امراضِ چشم کا ایک ماہر ڈاکٹر آیا۔ غلام احمد وسیم کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

''میں بوڑھا ہو گیا ہوں ڈاکٹر صاحب، ان آنکھوں نے جی بھر کے دنیا دیکھی ہے۔ اب یہ آنکھیں میرے لیے بے کار ہیں۔ میں یہ آنکھیں اپنے نابینا بیٹے کو دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اندھے کو آنکھیں لگوائی جا سکتی ہیں۔''

"یہ بیماری بالکل مختلف ہے میاں۔" ڈاکٹر بولا۔ "آپ کی آنکھیں یہاں کام نہیں کریں گی۔ آپ اپنے بیٹے کو طاقت بخش خوراک کھلائیے۔ ایک روز بیٹے کی بینائی لوٹ سکتی ہے۔"

غلام احمد مایوس لوٹ آیا۔ میاں بیوی دونوں خود کم کھا کر اور رموٹا جھوٹا پہن کر بھی ڈاکٹروں کی ہدایت پر وسیم کو مقوی خوراک کھلاتے تھے۔

ایک روز غلام احمد خبر لایا کہ امریکہ میں بیٹے کی نابینائی کا کامیاب علاج ہو سکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی اپنے ایک شناسا آدمی کے پاس گئے جس کا بیٹا امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔ اس آدمی نے ایک کاغذ پر امریکہ آنے جانے کا خرچ اور علاج کا حساب لگایا تو غلام احمد چکرا گیا اور وسیم کو امریکہ لے جانے کا ارادہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

گھر آ کر غلام احمد نے حساب لگایا کہ ریٹائر ہونے کے بعد جب گریچیوٹی اور جی پی فنڈ کی رقمیں اسے ملیں گی تو اپنی جمع پونجی ملا کر وہ شاید وسیم کو امریکہ لے جانے کے قابل ہو سکے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ اگر اس کے لیے اپنا مکان بھی فروخت کرنا پڑے تو وہ گریز نہیں کرے گا۔

اسی دوران حنا کو دوسرا بچہ ہوا۔ اس خوشی میں سسرال والوں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ غلام احمد اور بیگم بھی دعوت میں شریک ہوئے۔ سب خوشی سے جھوم رہے تھے۔ بچے گیت گا رہے تھے لیکن غلام احمد بیگم کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ان کی جان تو ہر وقت وسیم کی یاد کی سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔

"زینب، ہمیں ایک بیٹا چاہیے۔" ایک روز خلوت میں وہ بیگم سے بولا۔

بیگم کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"کیسی بات کرتے ہو؟ اس عمر میں بیٹا؟" بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

غلام احمد اپنے الفاظ پر پشیمان ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ "ہم نے خدا سے ایک بیٹا مانگا تھا جو خدا نے ہمیں دے دیا۔ لیکن..." وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ سیما کے لے پیغام آیا۔ غلام احمد نے جی پی فنڈ سے آخری رقم نکالی جو سیما کی شادی پر خرچ ہو گئی۔ وسیم کو امریکہ لے جانے کی خواہش دل ہی دل میں دب کر رہ گئی۔

سیما کی شادی ہوئے ایک سال ہوا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ غلام احمد اور بیگم آنگن میں دھوپ میں بیٹھے تھے۔ اچانک وسیم چلایا۔ ''پاپا، پاپا! میں دیکھ رہا ہوں۔''

غلام احمد اور بیگم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن جب وسیم نے آنگن میں اُگے تلسی کا پودا پہچان لیا، مُنڈیر پر بیٹھے کوے کا ذکر کیا اور غلام احمد کے ہاتھ کی اٹھی ہوئی اُنگلیاں ٹھیک ٹھیک گن لیں تو وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے۔

کچھ مدت کے بعد وسیم کی بینائی پوری طرح لوٹ آئی۔ وہ اب بانکا سجیلا جوان لگتا تھا۔

غلام احمد اور زینب بیگم کے لیے ایک دفعہ پھر وہی زمانہ لوٹ آیا۔ لیکن وہ خود پہلے کی طرح نہیں رہے تھے۔ وقت سے پہلے بڑھاپے کا سایہ ان پر پڑا تھا۔ زینب کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریوں اور شکنوں نے ایک جال سا بُن رکھا تھا۔ غلام احمد کی بینائی تقریباً چلی گئی تھی اور وہ سدا بیمار رہنے لگا تھا۔

(بیسویں صدی، دہلی)



اپنے سیل فون کو ذرا آرام دو

جب سے جمن خان کو نیا نیا سیل فون ملا، وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ بار بار فون کرنا اس کا مشغلہ بنا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اپنے لنگوٹیا یار مسکین سلیمانی کا نمبر ملایا۔ "Not Reachable" فون میں ایک خاتون کی مانوس آواز آئی۔

''کم بخت، ایسی کون سی جگہ گیا جہاں آواز نہیں جاتی ہے۔'' جمن خان نے دل ہی دل میں سوچا۔ دوبارہ نمبر ملایا، وہی آواز آئی۔

جمن خان بڑبڑایا۔'' آوارہ، بنجارہ، خانہ بدوش بنا ہے۔''

پھر اپنی بیوی کا نمبر ملایا۔ جواب میں خاتون نے Not Reachable کا جملہ دہرایا۔

جمن خان نے فون پر اپنا منہ لگا کر کہا:

''میڈم! میری بیوی میری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے لیے کھانا بنا رہی ہوگی۔ آپ ٹھیک طرح معلوم کریں۔''

جمن خان نے دوبارہ بٹن دبایا۔ جواب میں خاتون نے وہی جملہ دہرایا۔ جمن خان گھبرایا۔ ایک آٹو والے کو پکارا اور گھر کی راہ لی۔

آٹو رکشا سے اتر کر سہا سہا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ منا پاس بیٹھا چاکلیٹ کھا رہا تھا۔ جمن خان نے اطمینان کا سانس لیا۔

''کہاں گئی تھی؟''

''کہاں جاتی!''

''فون پر نوٹ ریچیبل آرہا تھا۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''تم ایسی جگہ چلی گئی ہو جہاں فون کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔''

''میں تو کمرے سے باہر نکلی ہی نہیں۔''

''ہونہہ۔'' جمن خان بولا۔ ''ادھر آؤ، منا! تم بھی آؤ۔''

''میرے ساتھ بیٹھو، کندھا سے کندھا ملا کر، بالکل چمٹ کر بیٹھو۔''

''بچے کے سامنے یہ کیا حرکت کر رہے ہو؟'' بیوی بولی۔

''منا، تم بھی مجھ سے لگ کر بیٹھو۔ ٹھیک طرح سے۔ شاباش!'' جمن خان بولا۔

''اب میں تمہیں فون کرتا ہوں۔'' جمن خان نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔

جواب میں Not Reachable آیا۔

''ابے لڑکی، کیا بک رہی ہو؟ میری بیوی بالکل میرے پاس بیٹھی ہے... بالکل چمٹ کر، چڑیل کہیں کی ـــ نگوڑی۔''

''اب بند بھی کرو۔ کس کو گالی دے رہے ہیں۔''

''اس ڈائن کو جو اس سیل فون کے اندر چھپی ہے۔''

''اس میں کیسے چھپ سکتی ہے؟''

جمن خان نے اپنے استاد چراغ بیگ کو فون کیا۔

فون میں سے جواب آیا۔ ''یہ نمبر موجود نہیں ہے۔ آپ نمبر جانچ لیں۔''

''کیوں موجود نہیں ہے۔ اس نمبر پر میں نے پچھلے پانچ روز میں پچاس مرتبہ فون کیا ہے۔'' جمن بولا۔ اور دوبارہ اس نمبر پر فون کیا۔

اب کے گھنٹی بجی اور جمن خان کے چہرے پر چمک آئی۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو جمن! میں قیلولہ لے رہا ہوں۔'' چراغ بیگ بولے۔

''جناب، فون والی لڑکی بولی کہ یہ نمبر موجود نہیں ہے۔ میں ڈر گیا آپ کا بھی وجود نہیں ہے۔''

''شیخ چلی جیسی بات نہیں کرو جمن۔کل سے بی ایس این ایل کا پورا نظام بیٹھا ہے۔تمہارا فون لگ گیا۔اب شاید ٹھیک ہو گیا ہو گا۔''

''جناب! یہ لڑکی بار بار کیوں جھوٹ بول رہی ہے؟''

''کون لڑکی؟''

''نگوڑی، جو فون پر ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہی ہے۔کبھی کہتی ہے، پہنچ سے باہر ہے، کبھی کہتی ہے نمبر موجود نہیں ہے۔ جناب کیا فون کے اندر جھوٹ بولنے والا ننھا سا کیسٹ رکھا ہے؟''

''کوئی کیسٹ ویسٹ نہیں رکھا ہے۔تمہاری آواز کو فون کی مقناطیسی توانائی مطلوبہ نمبر تک پہنچاتی ہے۔جب اس سے رابطہ نہ ہو تو ٹاور سے جواب آتا ہے۔''

چند لمحوں کے بعد چراغ بیگ بولے۔''مجھے اب سونے دو۔تم بھی آرام کرو۔''

جمن خان نچلا بیٹھنے والا انسان نہیں تھا۔مسکین سلیمانی کو فون کیا۔ایک دفعہ پھر Not Reachable کا جواب آیا۔ پھر بیوی کو فون کیا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔جمن خان حیران بلکہ پریشان تھا کہ اکیلا استاد محترم چراغ بیگ کو فون کیوں جاتا ہے۔ضرور اس میں کوئی راز ہے۔دوبارہ انہیں فون کیا لیکن نہیں گیا۔کئی مرتبہ نمبر ملاتا رہا، آخر گھنٹی بجی۔

''جمن، تمہیں فون کرنے کا خبط ہے۔'' چراغ بیگ بھنبھنا اٹھے۔''جب سے تمہارے ہاتھ یہ فون آیا ہے، مجھے صبح و شام تنگ کر رہے ہو۔ یاد رکھنا اگر تم نے دوبارہ مجھے فون کیا تو میں تم سے یہ فون چھین لوں گا اور تمہارے مکان کے عقب میں جو مین ہول ہے، دو ٹکڑے کر کے اس میں پھینک دوں گا۔''

جمن خان نے چپکے سے فون کو چرمی بٹوے میں بند کر کے جیب میں ڈالا۔۔

دوسرے روز صبح سے ہی فون ٹھپ تھا۔جمن خان کو اپنے پڑوسی نے بتایا کہ مواصلات کا پورا نظام بیٹھا ہوا ہے اور 31 جولائی سے پہلے ٹھیک نہیں ہوگا۔لوگوں نے ایک روز پہلے مواصلات کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا تھا اور دھرنا دیا تھا۔ احتجاجیوں نے اپنے فون محکمہ مواصلات کے ایگزیکیٹو انجینئر کو یہ کہہ کر حوالے کیا کہ یہ بے مصرف آلہ ہے۔اس سے اپنے پاس رکھنا بے کار

ہے۔انجینئر نے احتجاجیوں کو یقین دلایا کہ 31 جولائی تک فون کا نظام ٹھیک ہوگا۔

31 جولائی کو ابھی ایک ہفتہ تھا۔جمن خان بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔دن دن گزار کر 31 جولائی آئی۔جمن خان نے خوشی محسوس کی۔اس کے لاشعور میں یہ بات محفوظ تھی کہ مہینے کا آخری دن دل آویز ہوتا ہے۔جمن خان کے والد سرکاری ملازم رہے تھے۔مہینے کے آخر میں سرکاری ملازم کو تنخواہ ملتی ہے اور ایک ریٹائر شدہ ملازم پنشن پاتا ہے۔مہینے کے آخری دن ملازم ریٹائر ہوتا ہے۔اس کے دفتر کے ملازمین اس کو تحفے تحائف پیش کرتے ہیں اور اس کے گھر پہنچاتے ہیں۔اس کے والد کو ریٹائر ہونے پر ایک سجی سجائی گاڑی میں ڈھیروں تحفے تحائف کے ساتھ گھر پہنچایا تھا۔تب سے جمن خاں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر مہینے کا آخری دن اچھا لگتا تھا۔

31 جولائی کو جمن خان صبح سویرے جاگا۔قہوہ پینے کے بعد اپنے چرمی بٹوے سے سیل فون نکالا اور خدا کا نام لے کر مسکین سلیمانی کا نمبر ملا کر بٹن دبایا۔فون میں سے بڑبڑاہٹ کی آواز آئی۔جمن خان بوکھلا اٹھا۔دوبارہ کیا اور وہی آواز آئی۔یہ اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔اس نے مجید کریانہ والے کو فون کیا جہاں صبح دودھ کی گاڑی رکتی تھی۔وہاں سے بھی یہی بے تکی آواز آئی۔جمن خان بڑا مایوس ہوا۔محکمہ مواصلات کو ایک موٹی گالی دی اور فون لے کر مسکین سلیمانی کے ہاں گیا۔مسکین سلیمانی بڑے تپاک سے ملا۔جمن خان نے فون کے بارے میں شکایات کا دفتر کھول دیا اور بڑبڑاہٹ کا ذکر کیا۔

مسکین سلیمانی بولا۔''جمن، انسان کی طرح فون بھی گونا گوں بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔اسے کھانسی، نزلہ اور زکام ہوتا ہے۔کبھی نظام ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔کبھی نظام تنفس کام نہیں کرتا ہے۔بی پی چڑھتی ہے، بخار ہوتا ہے۔خدا بچائے ڈینگو اور سوائن فلو تک کا شکار ہوتا ہے۔

جمن خان منہ کھولے اور آنکھیں پھیلائے حیرت سے مسکین سلیمانی کا منہ تاکنے لگا۔

''میں کیا سن رہا ہوں؟''جمن بولا۔

''تم ٹھیک سن رہے ہو۔''مسکین سلیمانی بولا۔''کبھی فون کی گھنٹی نہیں بجتی ہے۔کبھی بجتی

ہے لیکن بات نہیں ہو پاتی اور بل چڑھتا ہے۔ کبھی ایک طرف کی بات سنائی دیتی ہے کبھی یوں لگتا ہے کہ ایک بچہ تتلا تتلا کر باتیں کر رہا ہے۔ کبھی رک رک کر بولتا ہے یا بیچ بیچ میں بات کٹ جاتی ہے۔ کبھی فون کے اندر سے سنسناہٹ کی آواز آتی ہے۔ کبھی فون کا نمبر لگ تو جاتا ہے لیکن جواب دینے والا کوئی اور آدمی ہوتا ہے۔ کبھی گہری خاموشی طاری ہوتی ہے کہ موت کا گماں ہوتا ہے۔ کبھی آواز بڑی دھیمی ہوتی ہے کہ آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔ یہ بیماریاں تو ہیں۔ کبھی فون کو دیوانگی طاری ہوتی ہے۔''

''دیوانگی!'' جمن خان چلایا۔

''چلاؤ نہیں جمن، فون میں گاہے Echo ہوتا ہے۔ صدائے بازگشت آتی ہے...''

''مسکین، مشکل اردو نہیں بولو۔''

''گونج سی پیدا ہوتی ہے اور ہم جو کچھ بولیں، وہ اس کی نقل کرتا ہے۔ یہ دیوانگی نہیں تو کیا ہے! پاگل پن نہیں تو کیا ہے! میرے فون کو ذیابیطس کی شکایت ہے۔''

''ذیابیطس؟''

''ہاں، یہ خراب ہوتا رہتا ہے۔''

''پھر علاج کرانا تھا۔''

''میں اس دائم المریض فون کو چھوڑ رہا ہوں۔ اس کے کل پرزے خراب ہو گئے ہیں اور ایک نیا آلہ لے رہا ہوں۔''

''میرے فون کو کیا مرض ہے؟'' جمن خان نے اپنا فون مسکین سلیمانی کے ہاتھ میں دیا۔ مسکین سلیمانی نے ایک نمبر ملا کر اپنے کان سے لگایا اور بولا۔

''جمن، اس کی زبان کو لکنت ہے۔ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''پھر تو فون بلائے جان بھی ہے۔'' جمن خان بولا۔

''ہاں۔ تاہم کبھی کبھی خوش ہو کر ہمارے لیے تفریح کا سامان فراہم کرتا ہے۔''

''کیسی تفریح؟''

''دو آدمی باتیں کرتے ہیں اور تیسرا ان کو سن سکتا ہے۔''

''کیسے؟''

''یہ فون سے پوچھو۔ مجھ سے نہیں۔ کل دولڑکیاں بسنتی اور دمینتی آپس میں وہ وہ باتیں کر رہی تھیں کہ مزا آ گیا۔''

''مسکین، تم کہتا تھا کہ چھپ کر کسی کی بات سننا گناہ ہے۔''

''میں چھپ کر نہیں، کھلم کھلا سن رہا تھا۔''

مسکین سلیمانی جب بولنے پر آتا تھا تو رکتا نہیں تھا۔ جمن خان کو اس کی باتیں بڑی پسند تھیں۔ مسکین سلیمانی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں صبح سے میرے بی ایس این ایل اور ایئرٹیل دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے ایک ضروری کال کرنا تھا۔ لینڈ لائن یاد آیا۔ میری زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا: دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اور فون کا چونگا اٹھایا۔ ایسی گہری نیند سو رہا تھا کہ جاگنے سے بھی جاگ نہیں سکتا تھا۔ مدت سے اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی اس لیے روٹھ گیا تھا۔''

''کیا فون بھی روٹھ جاتا ہے؟'' جمن نے سوال کیا۔

''تم نہیں روٹھتے ہو؟ روٹھنا تو ہے ہی۔ جب سے موبائل فون آیا ہم نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہ ہماری مشکلات کو نہیں سمجھتا ہے۔ جب یہ خراب ہوتا ہے تو بڑی مشکل سے لائن مین آتا ہے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ کبھی لائن مین کے مڑتے ہی خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن سیل فون کو بھی ہم آرام کرنے نہیں دیتے۔ گاڑی چلاتے، غسل خانے میں نہاتے، کھانا کھاتے، کتاب پڑھتے، خبریں سنتے اور قضائے حاجت کرتے ہوئے اس پر باتیں کرتے ہیں۔ بچے اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ریسرچ کرتے ہیں۔ تجربے کرتے ہیں۔ ٹون بدلتے ہیں اور ہماری جمع شدہ فیس جلدی جلدی ختم ہوتی ہے۔ تاہم ہم ان سے استفادہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑوں کو سیل فون کے استعمال کے نئے نئے گر سکھاتے ہیں۔''

تب جمن خاں بولا۔ ''مسکین، مجھے بھی چند گر سکھاؤ۔''

''جمن، چراغ بیگ صاحب تمہارے بار بار فون کرنے سے چراغ پا ہوتے ہیں اور مجھے تاکید کی ہے کہ تم کو SMS کرنا نہ سکھاؤ۔''

''کیوں؟''

''ان کو اندیشہ ہے کہ جس طرح تم ان کو فون کی بوچھار کرتے ہو، اسی طرح SMS بھیج بھیج کر تنگ کرو گے۔''

''پھر فوٹو کھینچنا سکھاؤ۔'' جمن بولا۔

''فوٹو کھینچنا سکھاؤں گا۔ پہلے تم چراغ بیگ کے پاس جاؤ۔ اپنے کیے کی معافی مانگو۔ آخر وہ تمہارے استاد رہے ہیں۔''

''میں ضرور جاؤں گا۔''

''جمن، کل میں نے ایک جریدہ میں سیل فون کے موضوع پر ایک کہانی پڑھی۔ سنو گے؟''

''ضرور سنوں گا۔''

''آب و ہوا کی تبدیلی اور ماحولیات کی حفاظت پر ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ ابھی میٹنگ کے ایجنڈا پر بات شروع ہی ہوئی تھی کہ میٹنگ میں شریک ایک صاحب کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ فون لے کر باہر نکل گیا اور نہیں لوٹا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے میٹنگ کے دو شرکا کے فون کی گھنٹیاں بجیں۔ یہ بھی باتیں کرتے ہوئے نکل گئے اور واپس نہیں آئے۔ ابھی ایجنڈا پر بحث جاری تھی کہ اور گھنٹیاں بجیں۔ دوسروں کو دیکھا دیکھی یہ بھی چلے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ واحد صاحب صدر رہا اور میٹنگ کا ایجنڈا تھا۔ وہ بھی چلا گیا ہوتا، ان کا فون گھر پر رہ گیا تھا۔ صاحب صدر نے مایوسی کے عالم میں فون کی تلاش میں اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور ہر بار خالی ہاتھ باہر نکل آیا۔ کئی مرتبہ دفتر کے چوکیدار کو پکارا۔ جواب ندارد۔ لاچار باہر نکلا۔ چوکیدار تہہ خانہ میں اپنا سیل فون کان سے لگائے مسکرا مسکرا کر اپنی نوبیاہی بیوی سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔''

واہ، واہ! واہ، واہ! بڑی دلچسپ کہانی ہے۔'' جمن بولا۔

دوسرے روز جمن خان انڈوں کا ایک ٹرے لے کر چراغ بیگ کے پاس گیا اور معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''خاکسار کو معلوم نہیں تھا کہ آپ قیلولہ فرما رہے تھے۔''

چراغ بیگ نے سیل فون کے حسن و قبح پر قدرے ایک لمبا لیکچر دیا۔

''جمن، فون کے دو انتہائی پہلو ہیں۔ فون فوبیا اور فون مانیا۔ کبھی کسی انسان کے ساتھ فون نہ ہو تو وہ گھبرا جاتا ہے اور اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس کو فون فوبیا کا نام دیا گیا ہے۔ فوبیا کا مطلب خوف ہے۔ کسی کو پانی کا فوبیا ہوتا ہے۔ کسی کو آگ کا فوبیا ہوتا ہے۔ کوئی اونچائی سے ڈرتا ہے۔ دوسرے سینکڑوں فوبیا کی طرح فون کے فوبیا کو بھی لغت میں شامل کیا گیا۔

کسی کسی آدمی کو جنون کی حد تک فون کرنے کا خبط ہوتا ہے۔ اس کو فون کا مانیا کہا جاتا ہے۔ تمہیں بھی فون کرنے کا خبط ہے۔ فوبیا اور مانیا کے بیچ ایک درمیانی راستہ ہے جس سے فون کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے میری چھوٹی بیٹی ممی کا فون لے کر بازار سبزیاں وغیرہ خریدنے جاتی ہے۔ سبزی منڈی سے وہ مجھے فون کرتی ہے۔

'پاپا، گاجر نہیں ہے۔'

'پھر کیا ہے؟'

'مولی ہے۔'

'مولی لے آؤ۔'

'پاپا، چائے بروک بونڈ نہیں ملا۔'

'کیا تاج محل برانڈ ہے؟'

'ہے۔'

'پھر وہی لے آؤ۔'

'پاپا، گلی کے موڑ پر ایک کتا غرا رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'

'آس پاس کوئی آدمی نہیں ہے؟'

'کوئی نہیں ہے۔'

'رک جاؤ۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔'

ایک روز میری بڑی بیٹی رخشندہ کو پکنک سے واپسی پر دیر ہوئی۔ اس نے مجھے فون کیا۔

'پاپا، آج میں فہمیدہ کے ہاں رہوں گی۔'

پھر فہمیدہ کی ماں کا فون آتا ہے۔ 'چراغ بیگ صاحب، رخشندہ آج ہمارے ہاں رہے گی۔'

جمن! میں اپنے پڑوسی رستم زمانی کے بارے میں ایک واقعہ سناتا ہوں جس کو جنون کی حد تک فون کرنے کا خبط ہے۔ اس میدان میں وہ تم سے بہت آگے ہے۔''

''جناب! مجھے اب نہ ٹوکیے۔ میں آئندہ ضرورت کے بغیر آپ کو فون نہیں کروں گا۔'' جمن بولا۔

''شاباش! اس واقعہ میں تمہارے لیے اچھا سبق ہے۔'' چراغ بیگ بولے۔ ''رستم زمانی ایک اخبار میں کالم لکھتا ہے۔ ایک روز اس کی دادی اماں چل بسیں۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ دو تین آدمیوں نے اس کو فون کیا تھا اور Busy آیا تھا۔ میں نے بھی اپنے فون پر دو دفعہ ناکام کوشش کی۔ میں اکثر اس کو دو تین صحافیوں کے ساتھ ایک کافی ہاؤس میں دیکھتا تھا۔ میں اپنے اسکوٹر پر کافی ہاؤس گیا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ کافی ہاؤس کے ایک کونے میں اپنے سیل فون پر باتیں کرنے میں مگن تھا۔ بیچ بیچ میں کافی کا ایک گھونٹ نوش فرما رہا تھا۔ اس نے مجھے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ میں بیٹھ گیا اور بے تابی سے انتظار کرنے لگا کہ وہ اپنا فون ختم کرے اور میں اس کو اس کی دادی اماں کے انتقال کی بری خبر سناؤں اور پھر اس کو اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر اس کے گھر لے آؤں۔ لیکن اس کی باتیں ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے جب فون بند ہوا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

'ہیلتھ منسٹر تھے۔'

مجھے رستم زمانی کے اس انکشاف پر شبہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں بات شروع کرتا، اس نے فوراً فون کا بٹن دبایا اور اپنی داستان سرائی شروع کی اور ایک ویٹر کو اشارہ کیا کہ وہ میرے لیے کافی لائے۔

'میں کافی نہیں لوں گا۔' میں نے کہا۔ 'مجھے آپ کو بہت ضروری بات کہنی ہے۔'

لیکن رستم زمانی نے میری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنے فون پر بولتا رہا۔ اب کے

میں تیار تھا کہ وہ فون ختم کرے اور میں اس کو بری خبر سنا دوں۔ لیکن اس دفعہ بھی اس نے مجھے مات کیا۔ ادھر فون ختم ہوا اور مشکل سے میں صرف یہ کہہ پایا تھا۔ 'رسم زمانی' آپ کی دادی اماں...'' اس نے کسی اور سے بات چیت شروع کی۔ اور میری بات ادھوری ہیں۔ مجھے غصہ آیا اور قدرے اونچی آواز میں بولا۔ رستم، تمہاری دادی اماں... رستم زمانی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

'میری دادی اماں ہمارے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو اچھی اچھی اور پیاری پیاری کہانیاں سناتی ہیں۔'

میں نے کہا۔ 'وہ پیاری پیاری کہانیاں سنا کر اس دنیا سے چلی گئی ہیں۔'

لیکن اس کی اونچی آواز میں میری آواز ڈوب گئی۔ وہ کسی کو اپنے کارنامے سنا رہا تھا۔

میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ مجھے وہاں آئے آدھ گھنٹہ ہوا تھا۔

اسی لمحہ گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز رستم زمانی کی جیب سے آرہی تھی۔ کم بخت نے دو دو فون رکھے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اپنی جیب سے ایئرٹیل والا فون نکال کر اپنے کان سے لگایا اور بیک وقت اپنے بی ایس این ایل فون پر کچھ بولنے لگا۔ چند لمحوں کے لیے میں نے سوچا، شاید کوئی اس کو دادی اماں کی موت کی خبر دے رہا ہو۔ میں سانس روکے اس کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں وہ ہنستا ہوا بولا۔ 'یار تم بھی چھپا رستم نکلا۔ میں آج بڑا مصروف ہوں۔ نہیں آسکتا ہوں۔' اور اسی فون پر کوئی اور نمبر ملا کر باتیں کرنے لگا۔ میں نے اپنی گھڑی دکھا کر اس کو متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور مسکرا مسکرا کر زور سے باتیں کرنے لگا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھا۔ تاہم وہاں سے نکلنے سے پہلے چلا کر کہا:

'رستم زمانی! تمہاری دادی اماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔' اور اپنے اسکوٹر پر یہ جا وہ جا ہوا۔

'کیوں جی، رستم نہیں ملا؟' کئی آدمیوں نے مجھے ایک ساتھ پوچھا۔

'ملا تو تھا۔'

'پھر؟'

میں پونا گھنٹہ اس کے پاس رہا لیکن وہ اپنے دو دو فون اپنے کانوں سے چپکائے زور زور سے باتیں کرتا رہا اور میری بات بالکل نہیں سنی۔

میت کو دفن کر کے جب مولوی صاحب فاتحہ پڑھ رہا تھا تو رستم زمانی قبرستان پہنچا۔ ادھر مولوی صاحب کی فاتحہ خوانی ختم ہوئی، اُدھر رستم زمانی کے فون کی گھنٹی بجی اور اس نے اپنا فون کان سے لگایا۔"

OO

جینی

راحیلہ بولی۔ ''یہ لڑکی کیسی دیدہ دلیر ہے۔ نہ شرم و حیا، نہ ڈر۔ اتنی دور سے اکیلی آئی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی کتنے عجیب ہیں۔ اکیلی لڑکی کو جانے دیا ہے۔''

جینی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جینی کو انگریزی میں بتایا کہ راحیلہ کیا کہہ رہی ہے۔ البتہ شرم وحیا والی بات نہیں بتائی۔

جینی مسکرائی۔

''میں تو پردیس میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔'' راحیلہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ جب ہم بمبئی گئے تو وہ ہر قدم میرے ساتھ رہی تھی اور ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بار بار کہتی تھی۔ ''اگر میں بچھڑ جاؤں تو انسانوں کے اس سمندر میں کیسے آپ سے دوبارہ ملوں گی؟''

''تمہارے پاس ہوٹل کا جو پتہ ہے۔'' میں کہتا۔ ''تم ایک ٹیکسی میں ہوٹل پہنچ سکتی ہو۔'' لیکن وہ اکیلی ٹیکسی میں آنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔

جینی بڑی دلچسپی سے ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ جرمنی کی رہنے والی تھی اور پہلی دفعہ ہندوستان آئی تھی۔

لیہ آنے سے پہلے وہ کلکتہ گئی تھی اور مدر ٹریسا کے نام سے چلائے جا رہے ایک فلاحی ادارے میں رضاکارانہ طور پر ایک ماہ کام کیا تھا۔ وہ دھرم شالہ میں دو ماہ ٹھہری تھی جہاں اس نے تبتی پناہ گزینوں کے ایک ہسپتال میں کچھ دن کام کیا تھا۔

جینی نے کہا۔ ''جرمنی میں جب لڑکا لڑکی بالغ ہوجاتے ہیں تو ماں باپ سے الگ

ہو جاتے ہیں۔ جوان لڑکے لڑکیوں کا ماں باپ کے ساتھ رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتی۔ آپ کا معاشرہ اس لحاظ سے بڑا اچھا ہے۔ یہ ابھی شکست و ریخت سے دوچار نہیں ہوا ہے۔ یہاں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے۔ ہماری خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

وہ پیشے سے نرس تھی۔ سیر سپاٹا اس کا مشغلہ تھا۔ وہ پڑھنے کا اچھا ذوق رکھتی تھی اور مشرقی تمدن، مذہب اور فلسفہ سے گہری دلچسپی رکھتی تھی۔

اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے جینی بولی۔ ''میں نے اس سفر کے لیے اپنی ماں سے کچھ رقم اُدھار لی ہے۔ جرمنی پہنچ کر میں سب سے پہلے اپنی ماں کا قرضہ چکاؤں گی۔ ہمارے ہاں بالغ اولاد کا ماں باپ کے لیے بوجھ بننا برا سمجھا جاتا ہے۔''

''تمہاری ماں کیا کرتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ استانی ہے۔''

''اور باپ؟''

''مجھے اپنے باپ کا علم نہیں ہے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

میں قدرے حیرت سے اس کو دیکھنے لگا۔

''میری ماں کہتی ہے کہ میرا باپ ایک فرانسیسی ہے۔ پیرس میں اُن سے ملا تھا۔ وہ وہاں گھومنے گئی تھی۔ دونوں صرف ایک ماہ اکٹھے رہے تھے۔ اس کا نام پیٹرک کپلانی ین تھا۔

''ابھی وہ کہاں ہے؟''

''ہمیں کچھ معلوم نہیں۔'' جینی سادگی سے بولی۔ ''پچھلے سال میں نے پیرس میں ''دفترِ معلومات'' میں جا کر باپ سے متعلق دریافت کیا لیکن کچھ اتہ پتہ نہیں چلا۔'' یہ کہتے ہوئے جینی کے چہرے پر بھولپن آیا۔

راحیلہ میرا منہ تک رہی تھی کہ جینی کیا کہہ رہی ہے لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ جینی کی گمنام ولدیت کا انکشاف کر کے اس کی سوچ کو ٹھیس پہنچاؤں۔ راحیلہ جداگانہ سماجی پس منظر اور مذہبی

ماحول کی پروردہ تھی۔ اس کے مشرقی ذہن پر جینی کی بات نہیں بیٹھتی۔

''تم نے شادی نہیں کی؟''

''میرا بوائے فرینڈ جرمنی میں رہتا ہے۔ ہم تین سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔''

''ماں سے ملاقات رہتی ہے؟''

''ماں ہیڈل برگ میں رہتی ہے اور ہم چار سو کلومیٹر دور سپیئر میں رہتے ہیں جو ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ہے۔ میں سال میں دو تین بار ماں سے ملنے جاتی ہوں۔''

جینی نے ہم سے اجازت لے کر ایک سگریٹ جلایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے پڑھا تھا کہ مشرقی ملکوں میں عورتوں کا مقام مردوں سے الگ ہے۔ ہندوستان آکر مجھے اس کا ذاتی مشاہدہ ہوا ہے۔''

''ہمارے ہاں عورت چراغِ خانہ ہے جینی، شمعِ محفل نہیں۔ عورت کی عصمت اور عفت اس کا سب سے بڑا زیور ہے۔ ہماری تہذیب میں عریانی اور جنسی بے راہ روی کو دخل نہیں۔''

جینی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے تجسس کو دیکھ کر میں زیادہ بولنے لگا۔

''ہم روحانی قدروں کو مانتے ہیں اور مادّہ پرستی کے خلاف ہیں۔ ہم میں آج بھی وضعداری، رکھ رکھاؤ...''

''ان قدروں پر آپ فخر کر سکتے ہیں۔'' جینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عام سیاحوں کی طرح جینی کے پاس لداخ کی گائڈ بک کے علاوہ فری ڈم ایٹ مڈ نائٹ اور دی سٹی آف جوائے سمیت کئی علمی اور ادبی کتابیں تھیں۔

مختلف سماجی پس منظر اور متضاد نظریات کے باوجود راحیلہ جینی کو پسند کرنے لگی۔ وہ دونوں اشاروں اور کنایوں کی زبان میں باتیں کرتی تھیں۔

راحیلہ گیسٹ ہاؤس میں مغربی سیاحوں کی رہائش کو ملکی سیاحوں پر ترجیح دیتی۔ وہ کہتی۔ ''یہ لوگ پانی کفایت سے خرچ کرتے ہیں۔ بلا ضرورت بجلی ایک لمحہ نہیں جلاتے۔ باتھ روم میں کپڑے نہیں دھوتے۔ اپنا کمرہ صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ کسی چیز کو نہیں چھیڑتے۔ حکم نہیں

دیتے اور ہمیشہ شائستگی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔

دوسرے روز جینی صبح صبح خالی چائے دانی اور پیالی لے کر کچن میں آئی۔ رات اس نے اپنے کمرے میں چائے منگائی تھی۔

''میں کچھ کپڑے دھلوانے چاہتی ہوں۔ میں نے باتھ روم میں آپ کی نوٹس پڑھی۔ میں یہ کپڑے کہاں دھلواؤں؟''

''تم دھوبی کو دے سکتی ہو۔ یا چاہو تو نیچے نالے پر دھو سکتی ہو۔ سبھی دھوتے ہیں۔ دھونے کے بعد ایک دفعہ پبلک نل پر صاف پانی کی دھار میں ڈال کر نچوڑ لینا۔ نالے کا پانی زیادہ صاف نہیں ہے۔''

وہ ایک بالٹی میں کپڑے لے کر نالے پر گئی۔

کچھ دیر بعد وہ گیلے کپڑے لے کر لوٹی۔ ''کیا میں یہاں اپنے کپڑے سکھا سکتی ہوں؟'' اس نے الگنی کی طرف اشارہ کیا۔

''شوق سے۔''

ناشتہ کرنے وہ کچن میں آتی تھی۔ دو تین ملاقاتوں کے بعد اس سے متعلق نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی اور چرچ نہیں جاتی تھی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مغربی ملکوں میں رہنے والے اکثر لوگوں کو میں نے مذہب سے بیگانہ پایا ہے۔

جینی کو لداخ دو ہفتے رہنا تھا۔ اس دوران اس نے کئی گنپے دیکھے۔ تین روز ٹریکنگ کی۔ ایک روز وہ لیہ کے پاس تبتی پناہ گزیں کیمپ گئی۔ لیہ میں اس نے کچھ شاپنگ بھی کی۔

ایک روز وہ ایک قالین خرید کر لایا اور مجھے دکھایا۔ دکان دار نے اصل سے دوگنا دام لیا تھا۔

''قالین مہنگا لیا ہے۔ تمہیں بھاؤ تاؤ کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے جینی سے کہا۔ ''مجھے بھاؤ تاؤ کرنا نہیں آتا۔'' اُس نے اپنے شانے اُچکائے۔

دوسرے روز وہ کئی اور چیزیں خرید کر لائی۔ ان میں پرانا تالا، تھنکا (کپڑے پر مصوری) لداخی عورت کی زردوزی کی ہوئی کم خواب کی ٹوپی اور لکڑی کی بنی آرائشی چیزیں تھیں۔

اس دفعہ بھی اس کو بری طرح لوٹ لیا گیا تھا۔

''جینی، تم نے مقررہ داموں سے بہت زیادہ دیا ہے۔ قالین میں بھی تم بڑے گھاٹے میں رہیں۔''

''مجھے دکاندار پر بالکل شک نہیں ہوا۔'' جینی معصومیت سے بولی۔ ''وہ بڑا مذہبی آدمی تھا۔''

میں مجسم سوال بن کر اس کو دیکھنے لگا۔

''ہاتھ میں مالا لیے وہ کچھ جاپ کر رہا تھا اور میں نے اس پر بھروسہ کیا۔''

میں نے مشرقی تہذیب کی پاکیزگی اور روحانی تقدس کے نام پر اس لڑکی کو گمراہ کیا ہے۔ میں دل ہی دل میں نادم ہوا۔

میرا دل کہہ رہا تھا۔ ''اجنبی لڑکی! ہم لین دین کے معاملے میں کھرے نہیں ہیں۔ روپیہ کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور ہم خدا یا بھگوان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ میں نے مشرقی تہذیب اور روحانی قدروں کے نام پر تم کو بہکایا ہے۔''

لیکن دل کی بات میری زبان پر نہیں آئی۔

میں نے جینی سے کہا۔ ''یہ تاجر طبقہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتا ہے۔ ان سے قدم قدم پر مول تول اور بھاؤ تاؤ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ان کو منہ مانگے دام نہ دو۔''

جینی کی دہلی روانگی سے ایک روز پہلے لیہ میں بینک کے ملازموں نے ایک روزہ ہڑتال کی۔ اس لیے جینی بینک سے اپنے ٹریول چیک سے رقم نہیں بھنا سکی۔

جینی نے مجھ سے پوچھا کہ ایئرپورٹ سے کناٹ پلیس تک ٹیکسی کرایہ کتنا لگے گا۔

''یہی دو ڈھائی سو روپے۔ یہاں سے بھی آپ کو ایئرپورٹ تک ٹیکسی کرایہ ادا کرنا ہے۔ اس لیے چار پانچ سو روپے رکھنے چاہئیں۔''

جینی نے پانچ سو روپے اپنے پاس رکھ کر باقی رقم مجھے ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذمہ ابھی آپ کی کچھ رقم بقایا ہے۔ میں مارک میں آپ کو ادا کروں گی۔''

''صرف پچاس روپے واجب الادا ہیں۔ معمولی سی رقم ہے۔ دہلی سے آپ مجھے بھیج سکتی ہیں۔''

پانچ مارک کا ایک نوٹ مجھے پیش کرتے ہوئے جینی نے اصرار کیا۔ ''آپ کو یہ لینا ہوگا۔''

''میں تبتی پناہ گزینوں کے لیے جرمنی سے کچھ کپڑے بھیجنا چاہتی ہوں۔ کئی مہینے لگ سکتے

ہیں۔'' جینی بولی۔ '' آپ سے استدعا ہے کہ آپ اسے تبتی کیمپ تک پہنچانے کی زحمت کریں!''

جینی کو دہلی سے تھائی لینڈ اور پھر ملیشیا جانا تھا۔

کوئی دو ماہ بعد کولالمپور سے جینی کا ایک کارڈ آیا۔ کارڈ پر کولالمپور کی ایک عظیم الشان مسجد کی تصویر تھی۔ شاید اس تصویر کے انتخاب میں اس نے راحیلہ کی مذہبی عقیدت کو مدنظر رکھا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ہم جینی کو بھول گئے تھے کہ ایک روز اچانک ایک نو وارد لڑکی نے جینی کی یاد تازہ کر دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک بڑا بنڈل تھا۔

'' میرا نام سوسن ربی گر ہے۔ جینی نے یہ بنڈل اور ایک پیکٹ بھیجا ہے۔'' اس نے اپنے بیگ میں سے ایک پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

پیکٹ میں ایک خط کے علاوہ راحیلہ کے لیے سینٹ کی ایک شیشی، میرے بیٹے شہزاد کے لیے ایک کلکیو لیٹر اور میرے لیے ایک کتاب تھی۔

خط میں لکھا تھا کہ بنڈل میں ایک غریب بوڑھیا اور دو تبتیوں کے لیے پلاسٹک کی ایک سبز تھیلی میں کچھ کپڑے ہیں۔ میری پہچان کے لیے اس بوڑھیا کا رنگین فوٹو اور پتہ بھی ارسال کیا تھا۔ ان چیزوں کو متعلقین کو پہنچانے کے لیے مجھے تکلیف دہی پر جینی نے معذرت کا اظہار کیا تھا۔

'' اگر جینی کپلانی مین کو کوئی خط بھیجنا ہو تو میں لے جاؤں گی۔ میں ہوٹل میجک لینڈ میں ٹھہری ہوں۔'' سوسن نے جاتے ہوئے کہا۔

سوسن کے جانے کے بعد ہم نے بنڈل کھولا۔ اس میں تبتی پناہ گزینوں کے لے تین جیکٹ، دو ٹریکنگ شو اور کئی سوئٹر تھے۔

راحیلہ نے ایک جیکٹ کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ '' نواز، دیکھو تو ہمارے شہزاد کو یہ بالکل فٹ آئے گا۔ آپ نے شہزاد کے لیے بھی ایسے ہی ایک جیکٹ کی فرمائش کی ہوتی۔ ایسا فورین مال کہاں ملے گا؟ یہ ٹریک شو تو بالکل نیا لگتا ہے۔''

راحیلہ کی آواز میں بڑی حسرت تھی۔

(ماہنامہ بیسویں صدی)

OO

دو ملک، ایک کہانی

میرے بڑے بھائی اڑتیس سال بعد پاکستان سے لیہ پہنچنے والے تھے۔ دو روز پہلے وہ اسلام آباد سے دہلی پہنچے تھے۔

اس اڑتیس سال میں زمانہ بہت بدلا ہے۔ ہر چیز میں تبدیلی آئی ہے۔ ہمارے خاندان نے اس دوران کئی نشیب و فراز دیکھے۔ خوشی اور غمی کے لمحات آئے۔ بھائی جان کی روانگی کے کچھ عرصہ بعد دادا جان چل بسے۔ اس کے چند سال بعد والد صاحب نے داغ مفارقت دیا۔ پھر والدہ خدا کو پیاری ہوئیں۔ اسی اثنا میں دو ماموں، ممانیاں، خالائیں اور بھائی جان کے کئی احباب فوت ہوئے۔ اس دوران ہمارے خاندان اور اعزا و اقارب کے گھروں میں متعدد پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کا اضافہ ہوا۔

ادھر بھائی جان کی زندگی میں بھی کئی اونچ نیچ آئی اور وہ دولہا میاں سے دادا جان بنے۔

ہمارے بھائی سکردو بلتستان میں مقیم تھے۔ 1947 سے پہلے بلتستان متحدہ کشمیر میں لداخ کا ایک تحصیل تھا۔ ڈوگرہ منتظم اعلیٰ جس کو وزیر کہا جاتا تھا، گرمیوں کے چھ ماہ لیہ اور چھ ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔ وزیر کے ہمراہ اس کا سارا عملہ ارکان سکردو جاتا تھا۔ میرا بھائی کلرک تھا۔

سن 1947 اور اکتوبر کا مہینہ تھا۔ لیہ میں موسم سرما نے اپنی پرچھائیاں ڈالنی شروع کی تھیں۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور عالمی نقشے پر ایک نیا ملک پاکستان منظر عام پر آیا تھا۔ لیہ میں غیر یقینیت کا عالم تھا۔

میرے بھائی حسب معمول ڈوگرہ سرکار کے آخری وزیر لالہ امرناتھ کے ہمراہ سکردو

روانہ ہوئے۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا۔ بھائی جان کے ناک نقشے کی دھندلی دھندلی تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ جاتے وقت انہوں نے مجھے ایک اکنی دی تھی۔

ایک سال کے اندر بلتستان پاکستان کے زیرِ نگیں آیا اور بھائی جان ہمیشہ کے لیے وہاں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے اور بھی کئی لداخی ملازم تھے جو سکردو میں پھنس گئے۔ منشی غلام محمد ٹاک، خواجہ محمد اقبال، منشی عبدالحمید، ماسٹر غلام نبی حمامی، صنم چھرنگ، منشی غلام نبی۔ یہ چند نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ شروع شروع میں وہ اس امید پر جی رہے تھے کہ وہ دوبارہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملیں گے۔ ادھر ہمیں بھی یہی امید تھی کہ ان کی واپسی کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ بھابی صفیہ اور امی کو ہم روز دلاسہ دیتے تھے کہ بھائی جان ہم سے ضرور آملیں گے۔ ایسے میں دو سال گزر گئے۔

پہلے پہل دونوں ملکوں کے مابین خط و کتابت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار سنی سنائی اُڑتی سی خبر آتی تھی کہ بھائی جان خیریت سے ہیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے تحت رسل و رسائل اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور بری اور اچھی خبروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ منشی غلام محمد پہلا آدمی تھا، جس کو پہلی بُری خبر ملی۔ ان کی جوان اہلیہ کا لیہ میں انتقال ہوا تھا۔ منشی کو یہ خط براہ راست موصول ہوا۔ کوئی تعزیت کرنے والا نہیں۔ کوئی ڈھارس دینے والا نہیں۔ وہ روتا دھوتا اپنے دوستوں کے پاس گیا اور بری خبر سنائی۔

اس سانحہ کے بعد انہوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کے نجی خط براہ راست مکتوب علیہ کے بجائے کسی دوسرے دوست کو ملا کرے۔ اب ڈاکیہ کے لیے منشی غلام محمد ٹاک منشی عبدالحمید تھا۔ منشی عبدالحمید منشی غلام محمد ٹاک تھا۔ دین محمد خواجہ محمد اقبال تھا۔ خواجہ محمد اقبال غلام نبی حمامی تھا۔

بری خبریں ہی نہیں، چھٹیوں میں خوش خبریاں بھی ہوتی تھیں۔ فلاں کو بچہ ہوا۔ اصغر کو میڈیکل سیٹ ملی۔ انیس کو انجینئرنگ میں داخلہ ملا۔ جمیلہ کا بیٹا ملازم لگا۔ طفیل نے نیا مکان بنایا۔ لیکن سکردو میں رہتے ہوئے سب جانتے تھے کہ آگے پیچھے ہر ایک کو صدمہ پیش آنے والا

ہے کیونکہ سبھوں کے خاندان کے افراد تولیہ میں تھے۔ اس لیے ہر ایک سہما سہما رہتا تھا کہ کب کس کو بری خبر ملے۔ خواجہ محمد اقبال، منشی عبدالحمید اور صنم چھرنگ کو ماں، بہن اور کئی عزیزوں کے انتقال کی اطلاعات ملیں۔

ایک روز بھائی جان نے بھابی صفیہ کو طلاق نامہ بھیجا۔ اس کے ساتھ بھابی صفیہ کے نام ایک مفصل خط بھی تھا۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں لکھا تھا۔ "صفیہ! خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کبھی ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں لیکن فی الحال آثار یہ بتاتے ہیں کہ ہماری ملاقات کا امکان کم ہے۔ پچھلے چھ سال سے تمہاری یادوں کے سہارے میں اب تک جی رہا ہوں اور ہر لمحہ تم سے ملاقات کا خواب دیکھتا آیا ہوں۔ تم کب تک میرا انتظار کروگی۔ میں بھاری دل کے ساتھ طلاق بھیج رہا ہوں۔ تم ابھی چھوٹی ہو۔ حسین ہو۔ تمہیں ایک اچھا سا آدمی اپنی رفیقہ حیات بنائے گا۔"

اس کے تقریباً ایک سال بعد بھائی جان نے اپنے ایک خط میں اپنی شادی کی خبر دی تھی۔ یہ ستم ظریفی ہے، جس روز ہمیں یہ خط ملا، اُسی روز ہمارے والد خدا کو پیارے ہوئے۔

بھائی جان کے نام ہمارا بھیجا ہوا خط خواجہ محمد اقبال کو ملا۔ اس روز بھائی جان نے اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھا کہ منشی غلام محمد، عبدالسلام، خواجہ محمد اقبال، صنم چھرنگ اور چند احباب خراماں خراماں گھر کی طرف آرہے ہیں۔

"یہ آج کیوں آرہے ہیں؟ عید پر مبارک باد دینے اکٹھے آتے تھے۔ ہو نہ ہو بری خبر لے کر آرہے ہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے اور دل دھڑکنے لگا۔ "خدایا! میرے ماں باپ صحیح وسلامت ہوں۔" وہ دعا کرنے لگے۔

منشی غلام محمد کی قیادت میں وہ سب گھر میں داخل ہوئے۔ جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ والد صاحب فوت ہوئے تھے۔

ڈیڑھ ماہ بعد بھائی جان کی طرف سے ہمیں تعزیتی خط ملا۔ لکھا تھا: "کاش وہ بذاتِ خود اس صدمہ میں شریک ہونے کے لیے لیہ آسکتے۔"

بھائی جان سرکاری ملازم تھے۔ سکردو ریاست جموں وکشمیر کا حساس سرحدی علاقہ تھا اور

لیہ آنے کی اجازت حاصل کرنا مشکل تھا۔ ادھر میں بھی سرکاری ذرائع ابلاغ سے منسلک تھا۔ میرے لیے بھی سکردو جانے میں یہی مسئلہ درپیش تھا۔

اس کے سات سال بعد والدہ نے وفات پائی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو ماموں اور کئی احباب انتقال کر گئے۔

بٹوارہ ایک ملک کا نہیں ہوا تھا، بٹوارہ ایک شہر کا، ایک قصبہ کا، ایک گاؤں کا اور ایک خاندان اور گھر کا ہوا تھا۔ لائن آف کنٹرول کے آر پار سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو کھیتوں میں ہل جوتتے، پانی دیتے، فصل کاٹتے اور کھلیان جمع کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے لیکن جب ایک بھائی دوسرے بھائی سے ملنا چاہتا ہے تو لیہ یا کرگل آنا پڑتا ہے۔ لیہ سے دہلی ہوائی جہاز سے پرواز کرتا ہے۔ مہینوں کی تگ و دو اور انتظار کے بعد اگر ویزا ملے تو وہ کراچی، اسلام آباد یا لاہور جا کر اپنے بھائی سے ملاقات کر سکتا ہے۔ وہ بھی بھائی کے گاؤں میں نہیں۔ اپنے بھائی کے گاؤں سے اتنا قریب ہو کر بھی وہ اس گاؤں سے بہت دور ہے۔ آسمان کے ایک تارے کی طرح، جسے وہ دیکھ سکتا ہے، چھو نہیں سکتا۔

موسم بہار تھا۔ لیہ کے کھیتوں میں گیندے اور گل لالہ کے پھول کھلے تھے۔ بھائی جان کا خط ملا۔ یہ خوش خبری دی تھی کہ ان کے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔ اس کا نام ذکیہ رکھا ہے۔ بھابی زہرہ کی طرف سے سب کو سلام قبول ہو۔

ایک سال کی گردش پوری ہوئی۔ بڑے بھائی نے ایک اور بچی کی پیدائش کی خبر دی۔ اس کا نام زرینہ رکھا تھا۔

پھر خط و کتابت کا سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ 1965 کی لڑائی کے بعد ایک لمبے عرصے تک خط و کتابت کا سلسلہ بند ہوا۔ یہی صورت حال 1971 کی لڑائی کے بعد بھی ہوئی۔

خطوط کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو معلوم ہوا، ذکیہ دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ زرینہ نے آٹھویں جماعت پاس کی تھی۔ گھر میں فخر الدین اور محمد نعیم سے دو اور مہمانوں کا اضافہ ہوا تھا۔ اب خطوط میں سلام و دعا بھابی اور بھائی کی ہی نہیں، چاروں بہنوں اور بھائیوں

کے سلام آتے تھے۔ ادھر میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بنا تھا۔

انسانی نسل کی بقا کے لیے قدرت کا قانون چلتا آیا ہے۔ پیدائش، شادی اور موت کا یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ ہماری ماں اکثر کہتی تھیں۔ لڑکی پرائی ہوتی ہے۔ ایک روز متوقع طور پر بھائی کا خط ملا۔ ذکیہ کی شادی ہونے والی تھی اور رسمی طور پر خط کے ساتھ ایک دعوت نامہ بھی تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد زرینہ بھی رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئی۔

وقت کی گھڑی کی سوئی چلتی رہی۔ دن ہفتے میں، ہفتہ مہینے میں اور مہینہ سال میں تبدیل ہوتا رہا۔ بھائی جان اب دادا بن گئے تھے۔

اب اڑتیس سال کے بعد بڑے بھائی لیہ پہنچ رہے تھے۔ ہم نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کل موسم خوشگوار رہے اور دہلی-لیہ کی ہوائی اڑان منسوخ نہ ہو جائے۔

ہم تین ٹیکسیوں میں ایئرپورٹ پہنچے۔ ان میں ہمارے خاندان کے افراد، اعزا و اقارب اور بھائی جان کے کئی احباب تھے۔ افق پر بوئنگ طیارہ نمودار ہوا اور آن کی آن میں ہوائی اڈے پر اترا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جان لاؤنج سے نکلے۔ اگر ان کا ایک حالیہ فوٹو نہ ہوتا تو پہچاننا مشکل تھا۔ ہم نے سنا تھا جوانی میں وہ بڑے وجیہہ تھے۔ ایک ایک سے ان کا تعارف کیا گیا اور وہ ہر ایک سے بغلگیر ہوئے۔ سبھی جذباتی بن گئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انسان بھی کیا عجیب ہے۔ دکھی ہوتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی لمحہ آتا ہے تب بھی آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔

ٹیکسیاں لیہ کی طرف چلیں۔

"لیہ بہت بدل گیا ہے۔" ایئرپورٹ سے آگے سڑک کے دونوں طرف کے مکانات دیکھ کر بھائی جان بولے۔ "یہ جگہ بالکل ویران ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے یہاں بھوت پریت آتے ہیں۔ اس لیے شام کے بعد لوگ چلنے سے گھبراتے تھے۔"

"کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں بستیاں آباد ہوں گی۔" بھائی جان کا ایک دوست بولا۔

لیہ میں تبدیلیوں کے احوال بھائی جان پہلے بھی سنتے آ رہے تھے۔ اب وہ اپنی آنکھوں

سے دیکھ رہے تھے۔ تبدیلیاں سکردو میں بھی آئی تھیں۔

بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتادِ طبیعت بھی ایک جیسی ہے۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک دونوں خود مختار تھے۔ بلتستان نے لداخ کو پولو، موسیقی کے آلات اور غزل سے متعارف کرایا۔ لداخ نے بلتستان کو داستانیں اور گیت دیئے۔ بلتستان لداخ کو مکھن، سوکھی خوبانیاں، گری، سلاجیت، مٹی کے نادر برتن اور زہر مہرہ کی پیالیاں فراہم کرتا تھا اور ہم بلتستان کو پشمینہ، اون اور نمک مہیا کرتے تھے۔

پچھلے اڑتیس سالوں کے دوران لیہ اور سکردو میں بجلی، نل کا پانی اور فلم آئی۔ دونوں قصبوں میں کالج اور ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے۔

بھائی جان کے گھر پہنچتے ہی کئی لوگ ملنے آئے۔

"دین محمد! مجھے پہچانتے ہو؟" ایک دوست نے پوچھا۔

بھائی جان غور سے دیکھنے لگے۔

"نہیں پہچانا۔"

"میں احمد الدین ہوں۔"

دونوں گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے۔

"کیا برادر امیر الدین خیریت سے ہیں؟"

"وہ چھ ماہ پہلے چل بسے۔" احمد الدین کے لہجے میں اداسی تھی۔

"دین محمد، ہمارے اکثر دوست اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"جب کسی کے انتقال کی خبر میں سنتا تو میرا دل روتا تھا۔" بھائی جان اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولے۔ "میں سوچتا تھا، کاش مجھے دو پر ہوتے اور میں پھُر سے اڑ کر یہاں چلا آتا۔"

"خدا کا شکر ہے، مرنے سے پہلے ہماری ملاقات ہوئی۔"

بھائی جان بولے۔ "میں کبھی کبھی سوچتا تھا احمد کہ زندگی میں لداخ کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔"

''یہ پرویز احمد ہے۔ انجینئر ہے۔'' کسی نے ایک جوان سے بھائی کا تعارف کرایا۔

بھائی جان نے لاعلمی کے اظہار میں اپنے شانے اچکائے۔

''مرحوم اکبر شیخ کے بیٹے ہیں۔''

''یہ میرے سکردو جانے کے بہت سال بعد پیدا ہوا ہے۔'' بھائی جان بولے۔ ''آپ کے والد مرحوم سے ہمارے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی وفات کی خبر مجھے سکردو میں ملی۔''

ایک نووارد نے بھائی جان سے پہلے معانقہ کیا اور پھر مصافحہ کیا۔

''آپ غلام رسول ہونا؟'' بھائی نے پوچھا۔

''جی ہاں! غلام رسول ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا۔''

''آپ کے دو پیارے ننھے منے بچے ہوتے تھے۔ وہ آج کل کہاں ہیں؟''

''آپ کی دعا سے دونوں میرے ساتھ ہیں۔ مجید چار بچوں کا باپ ہے۔ وہ اپنا ہوٹل چلا رہا ہے۔ اکبر ٹھیکہ داری کرتا ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں۔''

''مبارک ہو۔''

''آپ میرے گھر کب آئیں گے؟''

''انشاء اللہ، میں ضرور آؤں گا۔''

غلام رسول کے چلے جانے کے بعد بھائی جان بولے۔ ''غلام رسول بہت غریب ہوتا تھا۔ گھر میں فاقہ کشی چلتی تھی۔ ماشاء اللہ اب بڑا خوش حال لگتا ہے۔''

''اب بڑا متمول ہے۔'' احمد الدین بولے۔ ''دونوں بیٹوں کو اچھا روزگار ہے۔ ان کے دو ٹرک اور دو ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں۔''

''پچھلے اڑتیس سال کے دوران حالات بڑے بدلے ہیں۔'' چچا غلام سلطان بولے۔

''سکردو میں بھی یہی نقشہ ہے۔'' بھائی بولے۔

پھر منشی غلام محمد کا چھوٹا بھائی اور بیٹا ملنے آئے اور منشی کی خبر خیریت دریافت کی۔

''وہ خیریت سے ہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ چٹھی اور کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔''

ایک بزرگ آئے اور کسی عبدالخالق کے بارے میں پوچھنے لگے۔

''میں نے سنا وہ کراچی میں ہے۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔''

صنم چھرنگ کے باپ آئے اور اپنے بیٹے کی خیریت پوچھنے لگے۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' بھائی جان بولے۔ ''بلتستان کے ایک گاؤں گنوخ میں رہتا ہے۔ شادی کی ہے۔ دو یا تین بچے ہیں۔ کبھی کبھی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لیے سکردو آتا ہے اور ملاقات ہوتی ہے۔ پچھلے دو تین ماہ سے نہیں دیکھا۔''

''آپ کے لداخ آنے کا اس کو علم نہیں ہوگا۔''

''جی نہیں۔''

''آپ کب واپس جا رہے ہیں؟''

''میں ابھی یہاں ہوں۔''

''میرا خط لے کر جائیے۔''

''ضرور لے جاؤں گا۔''

''میں کچھ تحفہ بھی آپ کے ہاتھ بھیجوں گا۔ مہربانی کر کے اسے دے دیجیے۔''

''بہتر۔ آپ لے آئیے۔''

دوسرے روز صبح بھائی جان بولے۔ ''بھائی، مجھے قبرستان لے چلو۔ ابا اور امی کی قبریں دکھاؤ۔''

ہم قبرستان گئے۔ وہ والد اور والدہ کی قبروں کے پاس کچھ دیر دوزانو بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر دنیا بھر کا غم سمٹ آیا تھا۔ اڑتیس سال بعد وہ ایک نئے اور اجنبی ملک سے اپنے آبائی وطن آئے تھے اور ان کی طویل غیر حاضری کے دوران والد اور والدہ دونوں اس دنیا سے چلے گئے تھے جن کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

بھائی جان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہونٹ کانپنے لگے۔ میں ان کی دلی کیفیت پڑھنے لگا۔ شاید وہ ابا اور امی سے کہہ رہے تھے۔ ''میں جیتے جی آپ دونوں سے نہیں مل سکا۔ آپ کی علالت پر آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ آپ دونوں نے مجھے پیار اور شفقت سے پال پوس کر جوان کیا۔ میں برسرِ روزگار ہوا لیکن میں آپ دونوں کا حق ادا نہیں کر سکا۔ میں آپ

کے احسانات کیسے چکاؤں؟ مجھے معاف کریں۔ میں بہت مجبور تھا ورنہ میں اس طرح غیر حاضر نہیں رہتا...''

ایک مہینہ گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ بھائی جان کے ویزا کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ اپنے نئے وطن سے ان کو گہری محبت تھی۔ جہاں ان کی اولاد، نئے رشتہ دار اور احباب تھے۔

ہم ان کو چھوڑنے ایئر پورٹ گئے۔ وہ اپنے ساتھ وہ تصویریں لے گئے جو لیہ میں ان کے قیام کے دوران کھینچی گئی تھیں۔

''اب آپ کو ویزا حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوگی۔ بھابی زہرہ کے ہمراہ دوبارہ جلدی آجائیں۔'' میں نے کہا۔

''پہلے بھابی آمنہ کے ساتھ آپ پاکستان آجایئے۔'' وہ بولے۔

سب نے بھاری دل کے ساتھ بھائی جان کو وداع کیا۔

1989 میں میرے بیٹے کی شادی پر برادر اور بھابی زہرہ لیہ آنے والے تھے لیکن بھابی زہرہ اچانک چل بسیں۔ پھر کشمیر میں شورش ہوئی۔ اس کے بعد خط و کتابت میں بڑی بے قاعدگی رہی۔ لمبی مدت کے بعد بھائی جان کا ایک خط ملا جس سے یہ عیاں ہوا کہ انہوں نے باقاعدگی سے خط لکھے ہیں لیکن مجھے نہیں ملے ہیں۔ میرے بھیجے گئے خطوط کی بھی یہی درگت ہوئی ہے۔ شروع شروع میں ہم اپنی جگہ یہ سوچتے رہے کہ خط لکھنے میں ہماری طرف سے سستی ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ صورت حال واضح ہوتی گئی۔ ہم حیران تھے کہ خیر خیریت کے سیدھے سادے بے ضرر یہ سارے نجی خطوط کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔

پھر میں نے براہ راست لیہ سے سکردو خط بھیجنے کے بجائے لیہ آنے والے یورپ کے کسی سیلانی کو لفافہ حوالہ کرتا ہوا میں درخواست کرتا کہ اس پر اپنے ملک کے ٹکٹ چسپاں کر کے پاکستان بھیجنے کی زحمت کریں۔ ستم ظریفی ہے کہ میرے خطوط کبھی لندن، کبھی برمنگھم، کبھی کوپن ہیگن یا یورپ کے کسی شہر سے ہزار میلوں کا سفر طے کر کے سکردو پہنچتے جبکہ سکردو لیہ سے صرف دو سو تین میل دور ہے۔

سکردو جانے کی تمنا مجھے ہمیشہ رہی ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہاں میرے بھائی ہیں

بلکہ اس لیے بھی کہ بلتستان اور لداخ مشترکہ ثقافت کے وارث رہے ہیں۔ دونوں خطوں کے عمر رسیدہ لوگ آج بھی ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں، جب چاہ ہوتی ہے تو راہ نکل آتی ہے۔ اگست 1995 میں پاک جرمن ریسرچ پروجیکٹ اور پاک لوک ورثہ کے اشتراک سے اسلام آباد میں ہندوکش قراقرم اور ہمالیہ کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت ملی۔ پروگرام میں سکردو سمیت شمالی علاقہ کا دورہ رکھا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں، میں نے بھائی کو عمداً اس کی اطلاع نہیں دی۔ میں ان کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اچانک سکردو پہنچتا اور ان کے مکان پر جا کر دروازے کو دستک دیتا اور کہتا۔ ''دیکھئے کون آیا ہے!''

لیکن میری یہ تمنا بر نہیں آئی۔ پاکستان کی وزارتِ داخلہ نے ہندوستانی شرکا کو شمالی علاقہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے پاکستان کے ممتاز تاریخ داں پروفیسر احمد دانی کو بتایا کہ میرا بھائی سکردو میں ہے اور پچھلے پینتالیس سال کے دوران ہماری صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔

''آپ کو ویزا مل جائے گا۔ آپ الگ سے درخواست دیں۔ یہ انسانی مسئلہ ہے۔'' وہ بولے۔

پاک جرمن ریسرچ پروجیکٹس کی چیئرمین پروفیسر Irmatrud Stellrecht بولیں۔ ''یہ تو بھائی اور بھائی کی ملاقات کا معاملہ ہے۔ ویزا مل جائے گا۔'' لیکن ویزا نہیں ملا۔ اسلام آباد میں لوک ورثہ کے ادارہ کے سربراہ ایم این خان نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''بھارت آ کر یہی مسئلہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ مجھے تاج محل دیکھنے کا شوق تھا لیکن مجھے دہلی سے آگرہ جانے کی اجازت نہیں ملی۔''

مجھے بھائی جان کو اپنی آمد کا فون پر اطلاع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اسلام آباد پہنچے۔ سات سال بعد یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ ماضی کی یادیں ایک دفعہ پھر تازہ ہوئیں۔ ذکیہ اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ ان سے اور ان کے چھ بچوں سے ملاقات ہوئی۔

اسلام آباد میں ہمارا آخری دن تھا۔ بلتی ادیبوں نے جن سے ہم پہلے سے متعارف تھے، مجھے اور لداخی قلم کار نوانگ چھرنگ شقسپو کو عشائیہ دیا۔ فریقین نے ایک دوسرے کے تئیں اپنے احساسات اور جذبات کو ٹیپ ریکارڈروں میں صدا بند کیا اور کتابوں کا تبادلہ کیا۔

اسی شام اسلام آباد کے پریزیڈنٹ ہوٹل میں میں نے بھائی جان کو اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمیشن کے فرسٹ سکریٹری کے نام اپنا ایک خط دیا کہ وہ ویزا کے لیے ان سے رابطہ قائم کریں۔ ہائی کمیشن نے ہندوستانی مندوبین کو ایک عشائیہ دیا تھا جہاں میں نے فرسٹ سکریٹری جی پرتھا سارتی سے جو بعد میں ہائی کمشنر بنے، اپنے بھائی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ کو حکومت پاکستان ویزا دے یا نہ دے، ہم آپ کے بھائی کو لیہ جانے کے لیے ضرور ویزا دیں گے۔''

دوسری صبح بھائی جان مجھے الوداع کرنے کے لیے اسلام آباد کے ایئرپورٹ آئے تھے۔

''مرنے سے پہلے ایک دفعہ لداخ آنا چاہتا ہوں۔'' بھائی جان بولے۔

''آپ اپنے بچوں کے لیے بھی پاسپورٹ بنا لیں۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ ہماری دوسری اور تیسری نسلوں کی اولاد ایک دوسرے سے ملیں۔''

بھائی جان لداخ نہیں آسکے اور شاید ایک دفعہ دوبارہ لداخ آنے کی خواہش کو دل میں لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔

ہندوستان اور پاکستان کی 65 سالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔

کبھی تو وہ کہانی ضرور لکھی جائے گی جو بچھڑے دلوں کو ملا دے گی۔

(اردو اکادمی، سرینگر)

○○

دوسری رات

شہر رنگ و نور میں ڈوبا ہوا تھا۔ دکانیں نیون لائٹ میں نہا رہی تھیں۔ مرمریں سڑکوں پر رنگ برنگی کاریں تھرک رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر خوش پوش انسانوں کی ریل پیل تھی۔ بناؤ سنگار کی چیزیں بیچنے والی دکانوں اور بیوٹی پارلوروں پر خوبصورت لڑکیوں کا جھرمٹ تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خوبصورت لگ رہا تھا۔

وہ اس شہر میں اجنبی تھا اور یہ اس کی پہلی رات تھی۔ ہوٹل میں اپنا مختصر سامان رکھ کر وہ شہر کی سڑکوں پر بے تحاشہ گھومنے لگا۔

مغربی موسیقی کی دُھن سن کر وہ ایک بار روم کے سامنے ٹھٹک گیا۔ قد آدم شیشوں کے پیچھے لڑکے اور لڑکیاں والہانہ انداز میں بانہوں میں بانہیں ڈالے تھرک رہے تھے۔ ان کے رقص میں ایک بے خودی، کیف اور سرمستی تھی۔ وہ دیر تک ان کے رقص سے محظوظ ہوتا رہا۔

ٹہلتا ہوا وہ ایک پارک کے سامنے پہنچا جہاں بجلی کی روشنی میں رنگین فوارہ کئی فٹ ہوا میں اُچھل کر رنگوں کا قوس قزح بناتا ہوا دھرتی کو چھو رہا تھا۔ سامنے سپید سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک لڑکی لمبی زلفوں کو سینے پر بکھیرے بے نیازی سے اپنی سڈول ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس نے شلوار کے پائینچے گھٹنے تک اوپر کیے تھے اور سڈول گلابی ٹانگوں پر پانی کے شفاف چھینٹے پڑ رہے تھے۔ عجب دلکش سماں تھا۔ لڑکی کی محویت دیکھ کر اس پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کے قدم وہاں سے اُٹھ نہیں رہے تھے۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی کا حسن ہے یا رنگین فوارہ کی دلکشی کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر دو خوبصورت نوجوان جوڑے پارک میں

داخل ہوئے۔ اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس شہر کی ہر لڑکی خوبصورت ہے۔ اس کو لگا جب آنکھیں چند حسین چہرے دیکھتی ہیں تو ساری لڑکیاں خوبصورت نظر آتی ہیں۔

دل ہی دل میں اس نے سوچا کہ اس کے آبا و اجداد کی اولاد خوش نصیب ہیں جنہیں ایسا خوبصورت شہر ملا ہے جہاں ہر لمحہ زندگی مسکراتی ہے۔ رنگ و نور کی بہار ہے۔ کیف و سرور ہے۔ اس کے اپنے قصبے میں شام کے بعد ہُو کا عالم طاری ہوتا ہے۔

وہ اپنے ہوٹل سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس نے واپسی پر ایک ٹیکسی لینے کا ارادہ کیا۔

دور سے اس نے ایک سنیما ہاؤس کی بالائی دیوار پر بجلی کی سرخ روشنی میں فلم ''ہمراز'' پڑھا جس کے نیچے ''ساتواں شاندار ہفتہ'' کی موٹی تحریر سپید برقی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ وہ واپس وطن جانے سے پہلے اس فلم کو دیکھے گا۔ اگر اس کے رشتے دار کا سراغ لگا تو اس کو غالباً ایک ساتھی بھی ملے گا جس کے ساتھ وہ فلم دیکھے گا۔

اس کے آگے ایک اور سنیما ہال میں انگریزی کی ایک فلم لگی تھی۔ وہ اسے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے قصبے کے واحد سنیما ہال میں اکثر پرانی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ایک نئی فلم کو پہنچتے پہنچتے سال دو سال لگ جاتے تھے۔

رات کے بارہ بجے جب وہ ہوٹل پہنچا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک لذت آگیں خمار تھا۔ بستر میں جاتے ہی وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح وہ دیر سے جاگا۔ ناشتہ کر کے جب وہ باہر آیا تو خوبصورت صاف ستھرے بچے وردیاں پہنے گلے سے ٹائیاں باندھے اسکول جا رہے تھے۔

وہ اس شہر میں آبا و اجداد کی تلاش میں آیا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے متعدد بار سنا تھا کہ اس کا پردادا تقریباً دو سو سال پہلے اپنے ماں باپ، گھر زمین اور اپنی مرحومہ بیوی کا اکلوتا بچہ چھوڑ کر ایک ہزار میل دور اس قصبے میں آکر بسا تھا، شادی کی تھی۔ اولاد ہوئی تھی اور اسی مٹی میں جذب ہوا تھا۔ تب اس شہر میں یہی اس کا ایک بیٹا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے باپ یا کسی کو علم نہیں تھا۔ پچھلے دو سو سال میں ان کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا تھا۔

اپنے باپ کی زبانی یہ بات اس کو ایک دیومالائی کہانی کی طرح لگی۔ کئی دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ اس شہر میں آکر اپنے پردادا کی اولاد سے ملے۔ یہی تجسس اس کو اس شہر میں لایا تھا۔ اس کے پاس اپنے پردادا کا نام اور اس محلے کا پتہ تھا جہاں وہ رہتے تھے۔ انہی کے سہارے وہ تین پشتوں کے راز سے پردہ ہٹانا چاہتا تھا۔

آٹو رکشہ شہر کے پُررونق بازاروں کو چھوڑ کر ایک ویران علاقے سے گزرنے لگا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گندی بستیاں گھومنے لگیں۔

محلے کے کئی پنساریوں، دونائیوں اور ایک دوافروش سے دریافت کرتا ہوا اُس نے وہ مکان پالیا جس کی تلاش میں وہ ایک ہزار میل دور سے یہاں آیا تھا۔ مکان کی پیشانی پر موٹے حرفوں میں ''غریبی'' لکھا تھا۔

دو گھنٹے بعد وہ اس گھر کے ایک فرد کی طرح تھا اور اس خاندان کی مکمل تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

بڑا بیٹا جمال کام پر گیا تھا۔ وہ تانگوں کی رنگائی کرتا تھا۔ دوسرا بیٹا اسلم بھی صبح کا گھر سے نکلا تھا۔ وہ دیا سلائی کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ جمال کے دو بچے اسکول گئے تھے۔ گھر پر ان کے والد محمد رمضان، منجھلا بیٹا اقبال، جمال کی بیوی اور ان کی دو بہنیں تھیں۔

اقبال بے کار تھا۔ محمد رمضان بولے۔ دو سال دفتروں کا چکر کاٹتے ہمارے جوتے گھِس گئے۔ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کے لہجے میں گہری شکایت اور کوفت تھی۔ اقبال کی آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں آئیں۔ ''ہم کئی خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔'' محمد رمضان اپنے خاندان کی سرگزشت سنانے لگے۔ ''میرے والد کو چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ دو بھائی ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ دونوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک نیپال جا کر بس گیا۔ ایک بھائی چند سال پہلے روزگار کی تلاش میں آسام گیا۔ باقی دو بھائی عثمان اور حمید اسی محلے میں رہتے ہیں۔ عثمان دو ماہ سے ہسپتال میں ہے۔ فیکٹری میں کام کرتے ہوئے اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ حمید گھر پر ہے۔ مجھ سے چھوٹا ہے۔ اکثر بیمار رہتا ہے۔ ہم کل صبح ان سے ملیں گے۔ آپ سے مل کر ان کو بڑی خوشی ہوگی۔''

وہ اور اقبال تھوڑی دیر کے لیے چھت پر آئے۔ مکانات ایک دوسرے سے جڑے یہ محلہ بڑا گنجان تھا۔ ایک ہی شہر کے اس تضاد کو دیکھ کر اس نے کوفت محسوس کی۔

"اقبال، شہر میں فلم 'ہمراز' چل رہی ہے۔ تم نے دیکھی تو نہیں۔"

"جی نہیں۔" اقبال بولا۔

"اور انگریزی فلم؟"

"جی نہیں۔"

"بھئی کل ہم فلم دیکھتے ہیں۔"

اقبال عمر میں اس سے دو سال چھوٹا تھا۔

"کیا تمہیں فلموں کا شوق نہیں؟"

اقبال خاموشی سے مسکرایا۔ وہ بڑا شرمیلا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ شہر کے فیشن ایبل حصے میں نہیں گیا تھا۔

ساڑھے چار بجے جمال کے دونوں بچے اسکول سے آئے۔ ان کے بدن پر یونیفارم نہیں تھا۔ پھٹے پرانے بستوں سے کتابیں نکل رہی تھیں۔

چھ بجے جمال آیا۔ اور شام سات بجے اسد۔

رات کو خاندان کے سارے افراد اس کے گرد جمع ہوئے۔

اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان کے لیے ایک بوجھ ہے۔ ایک نئے مہمان کی آمد کا مطلب ہے کہ کچھ زیادہ خرچ، کچھ اور الجھنیں اور پریشانیاں، ایک خالی کمرے کا انتظام جب دس افراد کے لیے پہلے ہی رہائش کی تنگی تھی۔

اس نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے لیے کوئی تحفہ نہیں لا سکا اور جمال کے دو بچوں کے ہاتھوں میں پانچ پانچ سو روپے کے دو نوٹ تھما دیئے۔

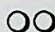
جمال اور باپ دونوں نے روپیہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ آپ ہمارے مہمان ہی نہیں بلکہ تین پشتوں کے بعد دو بٹے ہوئے خاندانوں کے ملاپ کی ایک نشانی بھی ہیں۔"

وہ ان کے خلوص سے بڑا متاثر ہوا۔

اس کے ذہن میں کوئی خمار نہیں تھا۔ کوئی سرور نہیں تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں اکیلا بستر پر دراز نت نئے خیالوں کے تھپیڑوں میں وہ جھکولے کھانے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ پھر بجلی چلی گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے کئی چہرے اُبھرنے لگے۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔

شہر میں یہ اس کی دوسری رات تھی۔

(بیسویں صدی، دہلی)



انجام

چھوٹے سے گاؤں میں مورتی کی چوری کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ صبح صبح لوگ چھوٹے سے گنپے کے پاس جمع ہوئے۔ کئی عورتیں جذبات میں آ کر رو رہی تھیں۔ گاؤں کے سب سے عمر رسیدہ پچاسی سالہ بزرگ صنم چھوانگ بولا۔ ''یہ مورتی بہت پرانی ہے۔ میں جب کمسن تھا یہ مورتی اس گنپہ میں تھی۔ میرے دادا اور پردادا سے یہ بات ہم تک چلی آ رہی ہے کہ مورتی تب بھی یہاں موجود تھی۔ چنڈازک (اویلوکیتیشورا) کی یہ مورتی گاؤں کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کے دم سے یہاں برکت ہے۔''

گاؤں کے نمبردار نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی وجہ سے ہم چھوت کی بیماریوں، قحط اور دوسری بلاؤں سے محفوظ رہے ہیں۔''

''اس کے ہاتھ جل جائیں جس نے ہمارے مقدس چنڈازک کو چھوا ہو اور اس کی آنکھیں چلی جائیں جس نے بُری نظروں سے دیکھا ہو۔'' عورتوں نے بددعائیں دیں۔

گنپے کا مہنت لاما ایک روز پہلے سہ پہر کو اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور پچھلی شام گنپہ کے ایک ملازم ٹشی پھلیے نے مورتیوں کے سامنے رکھی شمعیں جلائی تھیں۔ مہنت کی غیر موجودگی میں وہی گنپے کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ صبح تڑکے ٹشی پھلیے نے ڈرتے ڈرتے گاؤں کے نمبردار اور سماجی تنظیم کے ایک رکن کو نیند سے جگایا اور مورتی چوری کی اطلاع دی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُترا ہوا تھا۔ تینوں گنپہ تک آئے۔

''میں نے چابی یہاں رکھی تھی۔'' اس نے ایک چٹان کی کھوہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''صرف مہنت اور مجھے اس جگہ کا علم ہے۔ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں سہولت کے لیے ہم گنپے کی چابی یہاں چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں چابی لے کر یہاں تک آیا۔ حسب معمول گنپہ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ چنڈازک کی مورتی غائب ہے۔ میں نے جلدی جلدی دوسری مورتیاں اور ٹھنکے دیکھے۔ سبھی اپنی جگہ موجود تھے۔'' ٹشی نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''تم نے گنپہ کے آس پاس کسی مشکوک آدمی کو نہیں دیکھا؟ کل یا آج؟'' نمبردار نے پوچھا۔

''کسی کو نہیں دیکھا۔ کل شام میں نے حسب معمول بدھ اور چنڈازک کے سامنے دیے جلائے اور تالا بند کیا۔'' ٹشی پھلیے بولا۔

''یہ واردات رات کو ہوئی ہوگی۔'' سماجی فلاحی تنظیم کا ممبر بولا۔

''ٹشی پھلیے! یہ اچھا نہیں ہوا۔'' نمبردار بولا۔ ''اب ہم پر مصیبت آئے گی۔''

دوپہر کو مہنت پہنچا۔ اس کے کانوں میں چوری کی بھنک پڑی تھی۔

''آخر یہ کیسے ہوا؟'' اس نے غصے سے ٹشی پھلیے سے پوچھا۔

اُس نے سارا واقعہ سنایا۔ جو وہ صبح سے لوگوں کے سامنے کئی بار سنا چکا تھا۔

مہنت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے ماتھے پر ایک دوہتڑ مار کر کہا۔ ''یہ اس گاؤں کا سب سے انمول خزانہ تھا۔ چنڈازک کی یہ مورتی چھ سو سال پرانی ہے۔ راجہ ٹق جوم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی تھی اور گیالپو نے یہاں رکھوائی تھی۔''

تین روز بعد تفتیش کے لیے لیہ سے ایک پولیس سب انسپکٹر کی قیادت میں تین کانسٹیبلوں پر مشتمل ایک ٹکڑی آئی۔ ان کے سامنے ٹشی پھلیے نے ایک دفعہ وہی بیان دیا جو وہ سب کے سامنے دے چکا تھا۔

پولیس نے جائے واردات کو دیکھا۔

''تمہیں کسی پر شک ہے؟'' سب انسپکٹر نے ٹشی پھلیے سے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' اس نے جواب دیا۔

یہی سوال اس نے مہنت سے بھی کیا اور اس نے بھی نفی میں جواب دیا۔

''کیا اس دوران کوئی اجنبی گنپہ دیکھنے آیا؟''

''کوئی نہیں آیا۔'' مہنت نے جواب دیا۔'' البتہ حال میں بڑے دن پر ہمارے گاؤں والوں اور آس پاس کے دیہات کے چند لوگوں نے گنپہ کی یاترا کی۔''

''بودھی پہلے ماہ کی پندرہویں تاریخ کو ہر سال گنپہ کی یاترا کے لیے یہاں آتے ہیں اور گنپہ میں نذرانہ اور تیل چڑھاتے ہیں۔'' ممبر نے وضاحت کی۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''دس گیارہ دن پہلے کی بات ہے۔'' مہنت بولا۔'' مورتی کی چوری اس کے چھ دن بعد ہوئی۔''

سب انسپکٹر بولا۔'' یہ گاؤں غیر ملکیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ میں آتا ہے۔ پھر بھی کوئی کوئی سیاح انجانے میں یا جان بوجھ کر قانون توڑ لیتا ہے۔ کیا ایسی وارداتیں یہاں تو نہیں ہوتی ہیں؟''

''اس سال کوئی نہیں آیا۔ پچھلے سال دو غیر ملکی سیاح یہاں آئے تھے۔'' نمبردار بولا۔

''کیا اس گاؤں میں غیر مقامی آدمی کام کے سلسلے میں موجود ہیں؟ جیسے آج کل یہاں لداخ میں نیپالی، پنجابی، بہاری مزدور، ترکھان اور معمار ہر جگہ نظر آتے ہیں۔''

''جی نہیں۔'' ممبر اور نمبردار دونوں بولے۔'' ہمارے گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے۔''

''آپ کی نظر میں گاؤں میں کوئی ایسا آدمی ہے جس کا چال وچلن مشکوک ہو۔ یا جس کے خلاف چوری کا الزام ہے۔ عدالت میں مثل ہے یا پولیس میں کسی جرم کے لیے کیس بنا ہے؟'' سب انسپکٹر، نمبردار اور ممبر سے مخاطب ہوا۔

نمبردار، مہنت اور ممبر نے نفی میں جواب دیا۔

''پچھلے دو تین ماہ کے دوران گاؤں میں کوئی اجنبی آیا ہوگا؟ اور گنپہ دیکھا ہوگا؟ آپ یاد کیجیے۔''

مہنت، نمبردار اور ممبر نے چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا اور مہنت بولا۔ ''کوئی ایسا آدمی یاد نہیں آرہا ہے۔ گمپہ دیکھنے کے لیے کوئی اجنبی نہیں آیا۔''

''ہم نے کوئی مشکوک آدمی نہیں دیکھا۔ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کوئی بھی آئے سب کو فوراً پتہ چل جاتا ہے۔'' نمبردار بولا۔ ''البتہ پچھلے ماہ دو روز کے لیے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ لگا تھا۔ ایک ڈاکٹر اور دو ملازم ان کے ساتھ تھے۔ وہ سب لداخی تھے۔''

''ڈاکٹر کون تھا؟''

''ڈاکٹر صنم۔'' ممبر بولا۔

سب انسپکٹر خاموش سامنے کھڑے اونچے پہاڑوں کو تاکنے لگا۔

پھر وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف مڑا۔ دونوں میں تھوڑی دیر کے لیے کانا پھوسی ہوئی۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' سب انسپکٹر ٹشی پھلیے سے مخاطب ہوا۔

''اُس سامنے والے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔'' ٹشی پھلیے سے پہلے مہنت نے جواب دیا۔

''چلیئے وہاں تک جاتے ہیں۔'' سب انسپکٹر بولا۔

سبھی مکان تک پہنچے۔

دروازہ مقفل تھا۔

''کیا تم اکیلے ہو؟'' سب انسپکٹر، ٹشی پھلیے سے مخاطب ہوا۔

''نہیں، اس کی بیوی اور ایک لڑکی بھی ہے۔'' ممبر بولا۔ ''بیوی بیمار تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت پر لڑکی کے ہمراہ علاج کے لیے لیہ گئی ہے۔''

''تالا کھولو۔ ہم تمہارے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔'' سب انسپکٹر بولا۔

ٹشی پھلیے نے تالا کھولا۔ پولیس نے مکان کی تلاشی لی اور ٹشی پھلیے کے مکان کے ایک کمرے میں سے ایک مورتی برآمد ہوئی جو ایک ٹوکری میں چھپا رکھی تھی۔

''مورتی مل گئی!'' ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ سے مورتی لیتے ہوئے سب انسپکٹر خوشی سے چلایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک آئی۔

سبھی سب انسپکٹر کے گرد جمع ہوئے۔

مہنت بولا۔ ''ارے، میتریا کی یہ مورتی یہاں کہاں سے آئی؟'' مہنت نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''صاحب، ہماری مورتی اویلوکیتیشورا ہے۔ لیکن یہ کہاں سے آئی؟''

''ہاں، یہ کہاں سے آئی؟'' نمبردار، ممبر اور سبھی حیران تھے۔

''آج صبح میں نے اسی ٹوکری میں بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب یہ خالی تھی۔'' ٹشی پھلیے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''آپ ٹھیک طرح سے دیکھ لیں لاما جی۔'' سب انسپکٹر نے مورتی مہنت کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''نہیں، یہ نہیں ہے۔'' مہنت بولا۔ ''ہماری چنڈازک ہے۔''

نمبردار اور ممبر نے مہنت کی بات کی تائید کی۔

''پھر یہ مورتی کہاں سے آئی؟'' سب انسپکٹر نے خونخوار آنکھوں سے ٹشی پھلیے کی طرف دیکھا جو تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''جناب، آج صبح میں نے اس ٹوکری میں بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب اس میں کوئی مورتی نہیں تھی۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''پھر یہ کہاں سے آئی؟ آسمان سے اڑ کر تو نہیں آئے گی؟'' سب انسپکٹر دہاڑا۔

ٹشی پھلیے کی زبان کو چپ لگ گئی۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''ہم بھی حیران ہیں۔ آخر یہ مورتی کہاں سے آئی؟'' نمبردار بولا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دوسری مورتی بھی یہیں کہیں ہونی چاہیے۔'' سب انسپکٹر بولا۔ ''تم نے یہ مورتی کہاں سے چرائی؟ بتاؤ؟'' گرجتا ہوا ٹشی پھلیے کو ایک زناٹے دار چانٹا مارا، اور وہ اوندھے منہ نیچے گر گیا۔

''بتاؤ دوسری مورتی کہاں ہے؟'' سب انسپکٹر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگا۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔

''لاما جی، آپ نے ایک چور کو یہاں کیوں رکھا ہے؟'' سب انسپکٹر نے مہنت سے

مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ بیس سال سے یہاں کام کر رہا ہے۔ ہمیں کبھی اس کے خلاف معمولی شکایت بھی نہیں ہوئی۔" مہنت بولا۔

"انسپکٹر صاحب! یہ بڑا سیدھا سادا آدمی ہے۔" ممبر بولا۔ اس سے ٹشی پھلیے کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی ناک اور چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔

"انسان کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے؟" ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "اس نے سنا ہوگا کہ مورتی کا بڑا دام ملتا ہے اور لالچ میں آ گیا۔"

سب انسپکٹر بولا۔ "ہمیں ایک دفعہ پھر اس کے گھر اور آس پاس جگہوں کی تلاشی لینی چاہیے۔ اس نے مورتی کہیں چھپائی ہوگی۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔" اس نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔ "ان چٹانوں میں بھی ڈھونڈو۔" اس نے مکان کے پچھواڑے چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

تین گھنٹوں کی تلاشی کے بعد مورتی کا کچھ سراغ نہیں ملا۔

"ہم اس کو حراست میں لیتے ہیں۔ اس کے گھر سے مورتی برآمد ہوئی ہے۔ قانون کی نظر میں یہ مجرم ہے۔ ہم اسے مزید پوچھ تاچھ کے لیے لیہ لے جاتے ہیں۔" سب انسپکٹر نے نمبردار سے کہا۔

ایک کانسٹیبل نے ٹشی پھلیے کو ہتھکڑی پہنائی اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔

لیہ میں تنظیم کا ایک وفد سب انسپکٹر سے ملا اور جہاں میتریا کی مورتی کی بازیابی کے لیے سب انسپکٹر کو مبارکباد دی، وہاں اولیلو کیتیشورا اور دوسری گمشدہ مورتیوں اور تھنکوں کی بازیابی کے لیے زور دیا۔

میتریا کی یہ مورتی ایک سال پہلے ایک اور گنپہ سے چوری کی گئی تھی۔ ایک ہزار سال پرانی یہ مورتی تبت سے لداخ لائی گئی تھی۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ "ہمیں پورا یقین ہے کہ اولیلو کیتیشورا کی مورتی بھی اسی آدمی نے چوری کی ہے۔ یہ میتریا کی مورتی چرا سکتا ہے تو بھلا اولیلو کیتیشورا کی مورتی کیوں نہیں چرا سکتا۔"

''لیکن اس نے اب تک یہ مورتی کیوں نہیں بیچی؟'' وفد کے ایک ممبر نے پوچھا۔

''عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے وہ انتظار کر رہا تھا کہ لوگ چوری کی اس واردات کو بھول جائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو لیہ لانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ آج کل گاؤں سے مورتی لانا اور لیہ سے باہر لے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح پتہ چل جاتا ہے۔''

''کیا ملزم نے اقبالِ جرم کیا؟''

''چور کب کہتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ دو تین روز تک جرم کا اقبال کرلے گا۔ اور دوسری مورتی کا سراغ لگ جائے گا۔ اب دو تین روز صبر کریں اور پھر دیکھ لیجیے۔''

''آپ میتر یا کی مورتی کب گنپہ کو حوالے کر رہے ہیں؟'' وفد کے ایک رکن نے سوال کیا۔

''جب تحقیقات مکمل ہو جائے گی تو ہم فوراً حوالے کردیں گے۔''

وفد نے ایک دفعہ اور سب انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور ایک دفعہ درخواست کی کہ وہ مورتیوں کی بازیابی کے لیے موثر اقدام کریں۔

ڈاکٹر صنم تین دن کے دورے کے بعد گھر لوٹا تو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی سنا کہ لڑکی کا باپ مورتی چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کرکے لیہ لایا گیا ہے اور حوالات میں بند ہے۔

''کب؟ کہاں؟ اور کیسے؟'' صنم کے لیے یہ خبر سنسنی خیز تھی۔

''اُسی گنپہ سے چرائی ہوگی، جہاں وہ کام کرتا تھا۔'' ماں بولی۔

''نہیں ماں۔ اس گنپہ سے نہیں۔ وہ کسی اور گنپہ کی مورتی تھی۔'' صنم کی بہن نے درستی کی۔

''پدماں کہاں ہے؟'' صنم نے پوچھا۔

''تب سے وہ یہاں نہیں آئی۔'' بہن بولی۔

''صنم، کیا تم مورتی چور باپ کی بیٹی سے شادی کرو گے؟'' ماں نے سوال کیا۔

''میرا دل کہتا ہے وہ کبھی مورتی چوری نہیں کرے گا۔''

''پکا ثبوت ملے تو...؟'' بہن نے پوچھا۔

''اگر وہ بے گناہ بری ہو جاتا ہے تو کیا تم ہماری شادی پر اعتراض کرو گی؟'' صنم، بہن سے مخاطب ہوا۔

اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ بولا۔ ''میں پدماں کو بہت چاہتا ہوں ماں۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔''

ایک ہفتہ گزر گیا۔ تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ملزم ٹشی پھلیے پر ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ مارا پیٹا گیا۔ لالچ اور ترغیب دی گئی لیکن وہ آخری دم تک اپنے بیان پر ڈٹا رہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اور اس کے گھر سے برآمد شدہ مورتی اس نے نہیں چھپائی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جس ٹوکری میں مورتی پائی گئی، صبح اس نے ٹوکری گھاس لانے کے لیے استعمال کی تھی۔

ادھر گمشدہ مورتی نہ ملنے پر علاقے کے لوگوں میں غم و غصہ تھا۔

گنپہ تنظیم کا وفد سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملا اور مورتی نہ ملنے پر تشویش کا اظہار کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا کہ انسپکٹر نعمان کی چھٹی منسوخ کی گئی ہے اور وہ جلدی ہی مورتی چوری کا یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ سبھی جانتے ہیں، اس نے ماضی میں ایسی کئی وارداتوں کا سراغ لگایا ہے۔

انسپکٹر نعمان نے تحقیقات کا کام اپنے میں لیا اور کیس کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کیس میں کہیں جھول ہے اور معاملے کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔''

انسپکٹر نے صنم کو تھانے بلایا اور کہا۔ ''ڈاکٹر آپ کو میں نے اس لیے زحمت دی ہے کہ مورتی چوری کے کیس سے متعلق آپ سے کچھ تبادلۂ خیال کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ منعقد کیا تھا اور آپ نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی۔''

''جی ہاں انسپکٹر! میں نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی جس کی چوری ہوئی۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ میں نے ٹشی پھلیے کو کہا تھا کہ پرانی مورتیوں کی اکثر چوری ہوتی ہے۔ اس لیے خبردار اور ہوشیار رہے۔ اس کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ باپ بیٹی دونوں مجھے بولے۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو گنپوں کی مورتی چراتے ہیں؟''

میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات بڑی معصومیت سے کہہ رہے ہیں۔ دراصل ان کا لوگوں سے

بہت کم رابطہ ہے۔ یہ شاذ و نادر یہاں آتے ہیں۔ یہاں کیا ہو رہا ہے، ان کو بالکل پتہ نہیں ہے۔''

''پھر مورتی کی چوری کون کر سکتا ہے؟''

''نعمان صاحب! آپ ایک تجربہ کار پولیس افسر اور منجھے ہوئے سراغ رساں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کون مورتیوں کی چوری کرتے ہیں۔''

انسپکٹر نعمان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکان آئی۔

''ڈاکٹر! لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔ آپ نے اپنے پیشے میں سائیکالوجی پڑھی ہے۔ خوبصورتی کئی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ چوری کی اس واردات کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہونی چاہئے۔'' انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''انسپکٹر صاحب! کیا اس واقعے کے پیچھے بھی لڑکی کی خوبصورتی کا کوئی رول ہے؟''

''بالکل، لیکن معاملہ زیر تحقیق ہے۔ اس لیے اس بات کو آپ فی الحال اپنے تک محدود رکھیں۔ ڈاکٹر کیا آپ لڑکی کے حسن سے متاثر ہیں؟''

''میں متاثر ہی نہیں، لڑکی سے محبت کرتا ہوں انسپکٹر۔''

ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا۔ لوگ چوری کی واردات کو بھول چکے تھے۔ ایک روز اچانک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے قصبے کے چند سرکردہ افراد، گنپہ تنظیم کے عہدہ داروں، اخبار کے ایک نامہ نگار اور مقامی ریڈیو اسٹیشن کے نمائندے کو اپنے دفتر بلایا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حاضرین کا سواگت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے آپ کو یہاں مسروقہ مورتی کی بازیابی کی خوش خبری دینے کے لیے زحمت دی ہے۔ مجرم لال گوئل اور اس کے ساتھی انگت کو حراست میں لیا گیا ہے۔ انہوں نے کچھ سنسنی خیز باتوں کا انکشاف بھی کیا ہے جن سے آگے چل کر ہمیں گروہ کے دوسرے مجرموں کو پکڑنے میں مدد ملے گی۔''

تب ایس پی نے نعمان کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''مورتی کی بازیابی اور مجرموں کی گرفتاری میں انسپکٹر نعمان کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کیا ہے۔''

''انسپکٹر آپ نے یہ گتھی کیسے سلجھائی؟'' اخباری نامہ نگار نے سوال کیا۔

انسپکٹر نعمان نے کھانس کر اپنا گلہ صاف کیا اور بولا۔

"ہمارے سامنے پہلا بڑا سوال یہ تھا کہ آخر ملزم ٹشی پھلیے کو مورتی کی چوری کی واردات کے بعد پرانی مورتی اپنے گھر میں رکھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ جس کا وہ بذاتِ خود انکار کرتا ہے۔ دوسرا بڑا سوالیہ نشان یہ تھا کہ اس کے گھر سے ملی مورتی اصلی بھی ہے یا نہیں۔

پہلے سوال سے ہمیں اس مفروضے پر سوچنے کی تحریک ملی کہ اگر ملزم نے مورتی اپنے گھر میں چھپا نہیں رکھی تھی تو اس کو چھپانے والا کوئی اجنبی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا کوئی واقف کار ہونا چاہیے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے، میری پہلی نظر اور سوچ کہتی تھی کہ یہ اصلی مورتی ہو نہیں سکتی۔ کوئی بھی جانکار آدمی سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اصلی مورتی نہیں ہے۔ اصلی اور پرانی مورتی کی پشت پر مہر لگی ہوتی ہے۔ یہ خالص پیتل یا کانسے کی بنی ہوتی ہے۔ مورتی کے اندر کئی قیمتی چیزیں، مقدس منتر اور دعائیں لکھے ہوئے نسخے محفوظ کیے گئے ہوتے ہیں۔ نئی مورتی سانچے میں ڈھالی جاتی ہے جبکہ پرانی اور اصلی مورتی انسانی ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔ نئی مورتی کئی باتوں میں اس معیار پر نہیں اُترتی تھی۔ مورتی کو پرانا بنانے اور زنگ آلودہ دکھانے کے لیے ایسڈ کا استعمال ہوتا ہے یا جلتی ہوئی موم بتی انڈیل کر آگ پر تپائی جاتی ہے۔ یہ کام بھی اس مورتی پر کیا گیا تھا۔ لیکن بڑے بھدّے اور بے ڈھنگے طریقے سے ناتجربہ کار ہاتھوں کی یہ کوشش صاف دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے ایک ماہر کی رائے بھی پوچھی تو اس نے میری بات کی تصدیق کی اور مزید تصدیق کے لیے ہم نے اس کا کیمیائی تجزیہ کرایا اور ہمارا مفروضہ درست ثابت ہوا۔ بے شک نتیجہ آنے میں کچھ وقت لگا اور آپ بے تابی سے انتظار کرتے رہے۔ تاہم دیر آید درست آید، ہماری کوشش کامیاب رہی۔"

"جناب! یہی نقلی مورتی ہے۔" انسپکٹر نے میز پر رکھی نقلی مورتی دکھائی۔ گم شدہ مورتی ایک ہزار سال پرانی تھی اور گندھارا آرٹ کا نمونہ تھی۔"

"پھر اصلی مورتی کہاں گئی؟" اخباری نامہ نگار نے بے تابی سے پوچھا۔

"سنیے تو۔" انسپکٹر نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب سوال پیدا ہوا کہ آخر

یہ نقلی مورتی اس غریب آدمی کے گھر میں کیوں چھپائی گئی۔ یا تو چور اپنے جرم سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا یا ملزم سے مجرم کی دشمنی تھی۔ وہ اس کو بدنام کرنا چاہتا تھا اور کسی جرم میں ماخوذ کر کے اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ پہلی دلیل کے مقابلے میں ہمیں دوسری دلیل زیادہ وزن دار لگی۔ چنانچہ ہمارے سامنے دو مسئلے پیدا ہوئے۔ دو سوال اُبھرے۔ پہلا یہ کہ اس گاؤں میں پچھلے ڈیڑھ سال کے دوران کون اچانک دولت مند بن گیا ہے اور دوسرا ٹشی پھلیے اور اس کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

ایک لمحے کے توقف کے بعد انسپکٹر بولا۔

"تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ مجرم نے گاؤں میں ایک سال کے دوران ایک نیا بڑا مکان تعمیر کیا ہے۔ دس کنال زمین خریدی۔ ایک دکان کھولی جس پر اس کا لڑکا رہتا ہے۔ لیہ میں چار لاکھ روپے میں ایک کنال زمین لی اور خود چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کیے۔ گاؤں والے حیران تھے کہ یہ سب کچھ کرنے کے لیے اس کو کہاں سے ایک خزانہ ہاتھ لگا۔ ہم نے ٹشی پھلیے سے باز پرس کی۔ ہسپتال کے بیڈ پر اس کی بیوی سے رابطہ قائم کیا اور اس کی لڑکی کا بیان لیا کہ مجرم سے ان کے کیا تعلقات تھے؟ دشمنی تو نہیں تھی۔ کیا وہ بھی گنپہ میں آیا تھا۔ تب کئی دلچسپ تفصیلات منظر عام پر آئیں۔ وہ ایک پتھر سے دو پرندے مارنا چاہتا تھا۔ مورتی کی چوری بھی کرنا چاہتا تھا اور ملزم کی لڑکی سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ عمر میں وہ تقریباً لڑکی کے باپ کے برابر ہے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو پہلے ہی طلاق دی ہے۔ ماں باپ اور لڑکی تینوں اس شادی کے خلاف ہیں۔ جب کہ وہ شادی کرنے کے لیے مصر ہے۔

اسی دوران اس نے یہ بھی سنا کہ ایک نوجوان متمول ڈاکٹر لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس لیے وہ جلد از جلد معاملہ نپٹانا چاہتا تھا۔

حالیہ مورتی کی چوری سے کچھ روز پہلے وہ گنپے میں تیل کا نذرانہ چڑھانے آیا۔ یہ محض نمائشی عقیدت کا اظہار تھا۔ ٹشی پھلیے نے اس کے لیے کئی مرتبہ گنپے کا دروازہ کھولا۔ ایک روز اس نے ٹشی پھلیے کو ایک چھوٹی چٹان کے نیچے گنپے کی چابی چھپاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی اس چابی کو، جس پر اس کے مکان کے دروازے کے تالے کی چابی بھی تھی، چٹان کے نیچے رکھتا تھا

تاکہ اس کی غیر موجودگی میں مہنت چٹان کی کھوہ سے چابی نکال لے۔ صرف ٹشی پھلیے اور مہنت اس سے واقف تھے کہ وہ کہاں چابی چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس کے تین روز بعد مورتی غائب ہوئی۔ دروازے پر تالا لگا تھا لیکن مورتی نہیں تھی۔

جب ہم مجرم کو پکڑنے اس کے گھر گئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ گاؤں سے اچانک غائب ہوا تھا۔ ہم گاڑی میں واپس لیہ آرہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی ہمیں دیکھ کر چٹانوں کی اوٹ لیتا ہوا تیزی سے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ ڈھائی گھنٹے کے مسلسل تعاقب کے بعد ہمارے دو جوانوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو ہمیں مطلوب تھا۔ گرفتاری سے پہلے اس نے دو دفعہ اونچائی سے ہمارے اوپر بڑے بڑے پتھر لڑھکائے لیکن ہم نے جب ہوائی فائر کیے تو اس نے دوبارہ کوشش نہیں کی۔

اب کیا تھا؟ دو گھنٹے بعد اس نے اقبالِ جرم کیا اور صاف صاف بتایا کہ اس نے کیسے دو مورتیاں چرائیں۔

اس کے علاوہ ایک گنپہ سے دو پرانے تھنکے اور ایک گنپہ سے ایک مورتی چرانے کا اقبال کیا۔ نئی چرائی گئی مورتی یہ ہے۔ یہ چھ سو سال پرانی ہے۔ اس پر تبت، پالا اور گندھارا تینوں آرٹ کا اثر ہے۔ گیا لپوتق بوم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم میتریا کی نادر مورتی نہیں بچا سکے۔

چابیاں حاصل کرنے کے بعد مجرم نے دوسرے مجرم انگت کے ذریعے گنپہ اور ٹشی پھلیے کے گھر کی چابیوں کی ایک ڈپلیکیٹ بھی تیار کی تھی اور پولیس کے پہنچنے سے صرف دو گھنٹہ پہلے ٹشی پھلیے کے مکان میں کسی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نقلی مورتی ٹوکری میں چھپالی اور مکان پر تالا لگایا۔ یہ مورتی اس نے علی گڑھ میں بنوائی تھی اور اصلی مورتی کی کاربن کاپی تھی۔ جو اس نے ایک سال تک پہاڑ پر ایک چٹان کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑکی کے باپ کو مورتی چوری کے الزام میں گرفتار کرایا جائے۔ جب باپ راستے ہٹ جائے گا تو لڑکی کو پانا اور اس سے شادی کرنا آسان ہوگا۔ ماں ہمیشہ بیمار رہتی تھی اور اس کے خیال میں یہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

اس نے اور انگت نے اصلی مورتی ایک بڑے ڈبے میں اچار کے نیچے ڈال کر ہوائی جہاز میں لیہ سے چنڈی گڑھ لے لی جہاں سے اس کی نقل تیار کرنے وہ علی گڑھ گئے اور علی گڑھ سے بمبئی روانہ ہوئے جہاں مورتی اور دوٹھنکوں کے لیے دس لاکھ روپے ملے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ملک سے باہر اس کا دام چالیس پچاس لاکھ روپے کا ہوگا۔''

''چابیاں اُس نے جلدی کیسے بنائیں؟'' ریڈیو کے نمائندے نے سوال کیا۔

''موم پر اس نے دونوں چابیوں کا قالب اُتارا۔ یہ ترکیب اس کو انگت نے بتائی تھی۔ اسے لیہ لایا جہاں اتفاق سے ان دنوں نیچے سے چابیاں بیچنے اور بنانے والا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ کئی سال سے یہاں آ رہا ہے اور مسجد کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ ہم نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اس سے بھی ہمیں چوری کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔''

اخبار کے نامہ نگار نے سوال کیا۔ ''بمبئی میں مورتی کس نے خریدی؟''

''یہ ایک اہم سوال ہے۔ معاملہ کی تحقیقات جاری ہیں جو اس وقت ہم ظاہر نہیں کرسکتے۔'' انسپکٹر بولا۔ ''تاہم اتنا کہوں گا کہ مورتی چوری اور اسمگلنگ کرنے میں باقاعدہ ایک منظم گروہ کا ہاتھ ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس گروہ میں سماج کے کئی معزز آدمی بھی شامل ہیں جو تحقیقات کرنے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔''

''آخر ان لوگوں کو یہ ناجائز کام کرنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟'' حاضرین نے سوال کیا۔

''جناب، وہی لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں جو ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں کہ کب اس کو سو بنائے۔ یہ لوگ راتوں رات لکھ پتی بننا چاہتے ہیں۔'' انسپکٹر بولا۔

اس مرحلے پر سپرنٹنڈنٹ پولیس بولا۔ ''کوئی مذہب نہیں کہتا کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے عقیدے اور جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے جو کوئی مورتی چرا کر بیچتا ہے اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔''

(بیسویں صدی، دہلی)

OO

غیر یقینیت

لیہ پہنچتے ہی وہ بیمار ہوگیا۔ اس کے دوسرے ساتھی کام پر چلے گئے۔ وہ اکیلا بستر پر دراز رہا۔ اگرچہ آرام کرنے سے اس نے راحت محسوس کی لیکن دل میں کوفت تھی کہ وہ کام پر نہیں جاسکا اور ساڑھے تین سو روپیہ کی یومیہ اجرت کا نقصان ہوا۔

شاید بلندی کا اثر ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ تین سال پہلے بلندی نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ جب سر میں سخت درد ہوا تھا۔ جسم بھاری بھاری لگا تھا اور اُبکائی جیسی محسوس ہوئی تھی۔ تب دوائی کھانے اور ایک روز آرام کرنے سے وہ ٹھیک ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہوائی سفر کرنے کے بعد یہاں کم سے کم ایک روز آرام کرنا چاہیے۔ لیکن پچھلے دو سال کے دوران اسے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ جب ہوائی سفر کرنے کے بعد وہ اسی دن کام پر گیا تھا۔

لیہ- سرینگر کا راستہ بند تھا۔ مئی کے پہلے ہفتے سے پہلے راستہ کھلنے کی امید نہیں تھی۔ وہ ڈیڑھ ماہ پہلے آیا تھا۔ راستہ کھلنے سے پہلے مزدور نہیں ملتے تھے۔ اس لیے ٹھیکہ دار مزدوروں کو بذریعہ ہوائی جہاز لانے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ وہ مہینوں پہلے بکنگ کرتا تھا۔ جب کرایہ کم ہوتا تھا۔

دوپہر کو اس کے ساتھی مزدور واپس ڈیرہ لوٹے۔ ٹھیکہ دار نے مزدوروں کو ایک روز آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ گزشتہ سال پہلے روز کی مشقت سے کئی مزدور بیمار ہوگئے تھے۔

دوسرے روز اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی۔ بخار زیادہ شدید تھا اور سارا بدن دکھ رہا تھا۔ اس نے سیتا رام سے کہا کہ کام سے واپس آتے وقت بخار ٹوٹنے کی دو ٹکیاں ساتھ لیتے آئے اور پانچ روپے دیئے۔

''چلو، ہسپتال جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھانا بہتر رہے گا۔'' سیتارام بولا۔

''بڑی کمزوری ہے۔ مجھ سے چلا نہیں جائے گا۔'' وہ بولا۔

تیسرے روز قدرے افاقہ ہوا لیکن بخار پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ سر میں درد تھا۔ آرام کی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن بستر میں چین نہیں آتا تھا۔ دن دن ضائع ہونے پر وہ پریشان تھا۔ اس نے سوچا گھر میں بیماری صرف بیماری تک محدود رہتی ہے۔ پردیس میں عذاب جان ہوتی ہے۔

پچھلے سال جب وہ گھر لوٹا تو بخار ہوا تھا۔ وہ آرام سے بستر پر لیٹا رہا۔ کوئی غم نہیں۔ وہ پینتیس ہزار روپے نقد لے کر آیا تھا۔ گھر میں اناج، تیل اور دوسری ضروریات کا اسٹاک تھا۔ بیوی کھانا پکا رہی تھی، بچے اسکول گئے تھے، اس کو قہوہ پینے کی چاہت ہوئی۔

بیوی بولی۔ ''دار چینی نہیں ہے۔''

''پنساری سے لے آؤ۔''

بچے اسکول سے لوٹے۔

''ایک روپیہ کا کیا خریدا؟'' اس نے بچی سے پوچھا۔

''لولی پاپ!''

''شاباش!''

''اور تم نے؟''

''چیونگم!'' بچہ بولا۔

وہ ہنسا۔ ''ٹھیک طرح سے پڑھو۔ کل میں تم دونوں کے لیے چاکلیٹ لاؤں گا۔''

یہاں صورت حال مختلف تھی۔ ''تین روز کام پر نہ جانے کا مطلب ہے ایک ہزار پچاس روپے کا نقصان۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسی ذہنی کشمکش میں وہ سارا دن بستر پر کروٹ بدلتا رہا۔

شام کو اس نے ارادہ کیا کہ وہ دوسرے روز کام پر جائے گا۔ دوسری صبح وہ تمام مزدوروں کے ساتھ اٹھا۔ تین چار بار اٹھک بیٹھک کی۔ اپنے بازو اوپر نیچے کیے۔ اس نے نقاہت محسوس